اُردو (لازمی)

بارھویں جماعت



نام طالب علم ----------------------------

کالج ----------------------------

سیکشن ----------------------------



این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ۔ پشاور

اُردُو (لازمی)

بارھویں جماعت



ناشر

ڈی جے پرنٹرز اینڈ پبلیشرز

برائے

این ڈبلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ۔ پشاور

تیار کردہ: این۔ڈبلیو۔ایف۔پی ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور
بمطابق جدید نصاب (۱۹۸۸ء) بطورِ واحد نصابی کتاب برائے جملہ مدارس صوبہ سرحد و قبائلی علاقہ جات
ریویو کردہ: قومی ریویو کمیٹی، وفاقی وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان

مؤلفین

پروفیسر صوفی عبدالرشید: ــــــ پرنسپل گورنمنٹ کالج بالاکوٹ
پروفیسر محمد اکرم: ــــــ پرنسپل ونسم کالج گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسماعیل خان
دُرِ شہوار بیگ: ــــــ وائس پرنسپل جناح کالج فار ویمن پشاور یونیورسٹی
غلام محمد قاصر: ــــــ شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج پشاور (کنوینر)

مدیران

غلام محمد قاصر ــــــ ڈاکٹر ممتاز منگلوری

فہرست

مسجدِ نبوی

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

مسجدِ نبوی اور روضۂ مبارک الگ الگ عمارتوں کے نام نہیں اور ایک دُوسرے سے جُدا نہیں۔ مسجد کی عمارت بہت وسیع، شاندار اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر حسین و جمیل ہے۔ اس سے بڑی بعض مسجدیں ہندوستان کے اندر موجود ہیں اور دُوسرے ملکوں میں بھی یقیناً ہوں گی، لیکن حسن و جمال کے لحاظ سے، خوبی و محبوبی کے لحاظ سے، زیبائی و دلکشی کے لحاظ سے پردۂ زمین پر اس مسجد کا جواب نہیں۔ بس یہ جی چاہتا تھا کہ ہر وقت صحن میں بیٹھے ہُوئے عمارتِ مسجد کی طرف برابر ٹکٹکی لگی رہے۔ اللہ! اللہ! کس محبوب کی مسجد ہے۔ کیسے کیسے محبوبوں نے یہاں ماتھے ٹیکے ہیں۔ اینٹ اور پتھر، مٹّی اور چُونے تک پر محبوبیت چھا رہی ہے۔ مسجد کی پیمائش کا دماغ کس کو اور طول و عرض کا جائزہ لینے کا ہوش کسے لیکن بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ موجودہ[1] مسجد کا طول ۶۰۰ فٹ اور عرض ۴۸۰ فٹ ہے۔ قبلہ جنوب کے رُخ پر ہے۔ آگے پیچھے دس گیارہ دالان بنے ہُوئے ہیں۔ بہترین نقش و نگار سے آراستہ، حسن و زیبائش میں ایک سے ایک بڑھے ہُوئے اس کے بعض وسیع صحن، صحن کے دائیں اور بائیں دونوں جانب صحن ہی کے برابر لانبے لانبے دالان، بائیں جانب والے دالان میں عورتوں کے لیے جگہ مخصوص، کلام پاک کی آیات، بعض احادیث کے ٹکڑے، اسمائے الٰہی، اسمائے رسولؐ، اسمائے صحابۂ کبار سب موقع موقع سے در و دیوار پر کندہ، بڑی محراب، محراب عثمانی کے نام سے موسوم، یہ حضرت خلیفہ ثالث کی تعمیر کرائی ہوئی، منبر ٹھیک اُسی جگہ پر رکھا ہُوا جہاں عہدِ نبوّت میں تھا، اسی منبر اور روضۂ مبارک (حجرۂ عائشہ صدیقہؓ) کا درمیانی حصّہ "روضۃ الجنت" کے نام سے حدیث صحیح کی بنا پر موسوم، اتنے رقبے میں کوئی ڈھائی تین سو نمازیوں کی جگہ ہوگی۔ اسی حصّے میں محراب النبی اور مصلیٰ نبی یعنی وہ مقام جہاں سرکار خود کھڑے ہو کر امامت فرمایا کرتے تھے۔ اصلی مصلیٰ ایک دیوار سے چھپا دیا گیا ہے۔ صرف اتنا حصّہ کھلا ہے جہاں حضورؐ کے قدم مبارک ہوتے تھے۔ اس طرح اب جو قسمت کا دھنی وہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھتا ہے۔ اس کا سر قدرۃً و اضطراراً حضورؐ کے آثار قدم پر جا کر پڑتا ہے۔ خواجہ حافظ کا یہ مشہور شعر یہاں گویا لفظاً و معناً چسپاں ہے۔

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدہ گہ صاحب نظراں خواہد بود

---

[1]: اس سبق میں بعض معلومات مصنّف کے اپنے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ (مدیر)

اللہ اکبر! کیا شانِ جمال، کیا وسعتِ کرم ہے، خُدا جانے کتنوں کی نجات اِسی بہانے سے ہو جاتی ہے۔ عہدِ نبوت میں یہ تکلفات اور یہ وسعت کہاں تھی، مختصر سی زمین اور انتہائی سادگی، توسیع فاتح روم و ایران حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہُوئی، پھر خاص خاص ترمیمات حضرت عثمان غنیؓ اور خلیفہ ولید نے کرائیں۔ موجودہ عمارت کی تزئین و خوشنمائی کا سہرا سلطان عبدالمجید خان مرحوم و مغفور کے سر ہے۔ اللہ ان سب خُدامِ حرمِ نبوی کو پُورا اجر عطا فرمائے۔ اس وقت مسجد میں پانچ دروازے ہیں، دو جانبِ مغرب، باب السلام اور باب الرحمۃ، ایک جانبِ شمال باب مجیدی، سلطان عبدالمجید خان کا تعمیر کرایا ہُوا اور دو جانبِ مشرق، باب النساء اور بابِ جبریل۔ صحن میں شرقی دالان سے ملا ہُوا بستانِ فاطمہ تھا، کھجور کے چند شاداب درخت لگے ہُوئے تھے اور ان کے سائے میں ایک کنواں تھا جس کا پانی شرینی و لطافت میں مشہور تھا، سعودی حکومت نے وہ درخت کٹوا کر صاف کر دیے ہیں اور کنوئیں کو بند کر کے اس میں قفل ڈال دیا ہے، مسجد میں خُدام پہلے سینکڑوں تھے، اب گھٹ گئے ہیں۔ خواجہ سراؤں (آغاؤں) کی جماعت پہلے بہت ذی اختیار تھی، اب یہ لوگ بھی تعداد میں بہت کم رہ گئے ہیں، اور ان کے اختیارات بھی بہت محدود ہو گئے ہیں، ان کے بیٹھنے کا ایک وسیع چبوترہ باب جبریل اور باب النساء کے درمیان بنا ہُوا، کہا جاتا ہے کہ اصحابِ صفہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا بھی یہی چبوترہ تھا، مسجد کے ستونوں پر عہدِ نبوی کی مسجد کے حدود درج ہیں۔

اسی مسجد کے گوشہ جنوب و مشرق میں دالانوں کے اندر وہ سبز گنبد والا روضۂ اقدس ہے، جس کی زمین بقول محدث جلیل قاضی عیاض مالکی کے بلا نزاع و اختلاف سارے روئے زمین سے بڑھ کر ہے۔

مشقیں

۱ — درج ذیل اقتباسات کا مطلب وضاحت سے بیان کیجیے۔

(ا) ”اللہ اللہ! کس محبوب کی مسجد ہے۔ کیسے کیسے محبوبوں نے یہاں ماتھے ٹیکے ہیں۔ اینٹ اور پتھر، مٹی اور چونے تک پر محبوبیت چھا رہی ہے“۔

(ب) ”اصل مصلّٰی ایک دیوار سے چھپا دیا گیا ہے۔ صرف اتنا حصّہ کھلا ہے جہاں حضُور کے قدم مبارک ہوتے تھے۔ اس طرح اب جو قسمت کا دھنی وہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھتا ہے اس کا سر قدرتًا و اضطرارًا حضور کے آثارِ قدم پر جا کر پڑتا ہے“۔

۲ — اینٹ اور پتھر، مٹی اور چونا، نقش و نگار، طول و عرض، خوبی و محبوبی قواعد کی رُو سے کون سا مرکب ہیں؟

۳- "اللہ اکبر! کیا شانِ جمال، کیا وسعتِ کرم ہے۔ خُدا جانے کتنوں کی نجات اسی بہانے سے ہو جاتی ہے"؟
اندازِ تحریر کے والہانہ پن کی مثال یہ جُملہ ہے۔ اِس طرح کے کئی جملے اِس سبق میں آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔
ان میں سے پانچ جُملے منتخب کر کے اپنی کاپی میں درج کیجیے۔

۴- اِن الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ اِن کے معنی واضح ہو جائیں۔
خوبی و محبوبی۔ پردۂ زمین پر۔ زیبائی و دلکشی۔ ٹکٹکی لگانا۔ ماتھا ٹیکنا۔ کندہ۔ اضطراراً۔ شیرینی و لطافت۔ تزئین۔ نزاع و اختلاف۔

۵- جمع کے واحد اور واحد کے جمع لکھیے۔
عمارت۔ اسما۔ صحابہ۔ خلیفہ۔ حدیث۔ شعر۔ تکلّفات۔ خُدّام۔ باب۔ اختیارات۔ محدّث۔ حدود۔

۶- اس سبق میں سے مرکباتِ توصیفی تلاش کر کے لکھیے۔

۷- اس سبق میں سے اسمِ ظرفِ مکان تلاش کر کے لکھیے۔

۸- ان جملوں کو درست کر کے لکھیے۔

(ا) اس چوکھٹ پر بڑوں بڑوں نے ماتھے ٹیکا ہے۔

(ب) درودیوار پر اسمائے الٰہی لکھا ہے۔

(ج) خواجہ حافظ نے ایک مشہور شعر لکھی ہے۔

(د) ریگستان میں کھجور کے درخت اُگا ہُوا تھا۔

۹- آپ نے کوئی تاریخی عمارت دیکھی ہو تو ایک صفحے میں اس عمارت کے بارے میں تفصیلات لکھیے۔

مامون کی ولادت اور تعلیم و تربیت

مولانا شبلی نعمانی

(مامون) ربیع الاول ۱۷۰ھ میں پیدا ہُوا۔ اُس کی ولادت کی رات بھی عجیب رات تھی، جس میں ایک خلیفہ (ہادی) نے وفات پائی، دوسرا (ہارون الرشید) تخت نشین ہُوا، تیسرا (مامون) عالمِ وجود میں آیا۔ خلیفہ مہدی نے وصیت کی تھی کہ "میرے بعد ہادی تخت نشین ہو اور اس کے بعد ہارون"۔ ہادی نے بدنیتی سے ہارون کو محروم کرنا چاہا، اور چونکہ ہارون خانہ جنگیوں سے ہمیشہ پرہیز کرتا تھا، اس لیے ممکن تھا کہ ہادی اپنے خود غرضانہ ارادے میں کامیاب ہو جاتا، لیکن مَوت نے اُس کی تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ ہارون بسترِ خواب پر سو رہا تھا کہ وزیرِ اعظم یحیٰی نے جگا کر مژدۂ خلافت سُنایا۔ ہارون نے نہایت یاس سے کہا، "دیکھو، تم ہنسی کرتے ہو۔ بھائی صاحب سُن لیں گے تو یہی ہنسی بلائے جان ہو گی"۔ یحیٰی نے عرض کیا، "قضائے الٰہی نے اِس بحث کا فیصلہ کر دیا، آپ اطمینان سے سریرِ خلافت کو زینت دیں"۔ اسی گفتگو میں خواص مژدہ لائی کہ "مشکوئے مُعلّٰی میں وارثِ تاج و تخت پَیدا ہُوا"۔ یہی وہ مبارک فال لڑکا تھا، جس کی قسمت میں مامون الرشید ہونا لکھا تھا۔ ہارون نے مبارک فالی کے لحاظ سے عبداللہ نام رکھا، کیونکہ بانیٔ دولتِ عبّاسیہ، یعنی خلیفہ سفاح کا بھی یہی نام تھا۔ مامون کی ماں ایک کنیز تھی جس کا نام مراجل تھا اور بادغیس (ہرات کا ایک شہر ہے) میں پیدا ہُوئی تھی۔ علی ابنِ عیسیٰ گورنر خراسان نے اس کو ہارون کی خدمت میں پیش کش بھیجا تھا۔ افسوس ہے کہ مراجل دو چار روز کے بعد انتقال کر گئی اور مامون کو مادرِ مہربان کے دامنِ شفقت میں پلنا نصیب نہ ہُوا۔

مامون جب تقریباً پانچ برس کا ہُوا تو بڑے اہتمام سے اس کی تعلیم و تربیت شروع ہُوئی۔ دربار میں جو علماء اور مجتہدینِ فن موجود تھے، اُن میں سے دو شخص، یعنی کسائی نحوی اور یزیدی قرآن پڑھانے کے لیے مقرر ہُوئے۔ مامون کا سِن ہی کیا تھا، مگر طبّاعی اور فطانت کے جواہر ابھی سے چمک رہے تھے۔ کسائی کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ مامون کو پڑھنے کو کہتا تھا اور آپ چپکا سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا۔ مامون کہیں غلط پڑھ جاتا، تو فوراً کسائی کی نگاہ اُٹھ جاتی۔ اِتنے اشارے سے مامون مُتنبّہ ہو جاتا اور عبارت کو صحیح کر لیتا۔ ایک دن سورۂ صف کا سبق تھا، جب مامون اِس آیت پر پہنچا یَا یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ط (اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو؟ جو کرتے نہیں) تو بے اختیار کسائی کی نظر اُٹھ گئی۔ مامون نے خیال کیا کہ میں

نے شاید آیت کے پڑھنے میں کچھ غلطی کی، مگر جب مُکرر پڑھا، تو معلوم ہُوا کہ صحیح پڑھی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب کسائی چلا گیا، تو مامون ہارون کی خدمت میں حاضر ہُوا اور عرض کیا کہ " اگر حضور نے کسائی کو کچھ دینے کے لیے کہا، تو ایفائے وعدہ فرمائیے"۔ ہارون نے کہا، " ہاں' اس نے قاریوں کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی تھی، جس کو میں نے منظور بھی کیا تھا۔ کیا اس نے تم سے کچھ تذکرہ کیا؟" مامون نے کہا، " نہیں"۔ ہارون نے پُوچھا، " پھر تم کو کیونکر معلوم ہُوا؟" مامون نے اس وقت کا ماجرا عرض کیا اور کہا کہ خاص اس آیت پر کسائی کا دفعتہً چونک پڑنا بے وجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہارون اپنے کم سن بیٹے کی اس ذہانت سے نہایت متعجب اور خوش ہُوا۔ یزیدی مامون کا صرف معلم نہ تھا، بلکہ اتالیق بھی تھا اور مامون کے عام افعال و عادات کی نگرانی اس سے متعلق تھی۔ اس فرض کو یزیدی نہایت سچائی سے ادا کرتا تھا۔

ایک دن یزیدی اپنے معمول پر آیا۔ مامون اس وقت محل میں تھا۔ خدام نے یزیدی کے آنے کی اطلاع کی، مگر کسی وجہ سے مامون کو باہر آنے میں ذرا دیر ہوئی۔ نوکروں نے موقع پا کر یزیدی سے شکایت کی کہ " جب آپ تشریف نہیں رکھتے، تو صاحبزادے تمام ملازموں کو نہایت دِق کرتے ہیں"۔ مامون جب باہر آیا تو یزیدی نے چھ سات بَید مارے۔ اِتنے میں خادموں نے وزیر السلطنت جعفر بن یحییٰ برمکی کے آنے کی اطلاع کی۔ مامون فوراً آنسو پُونچھ کر فرش پر جا بیٹھا اور حکم دیا کہ اچھا آنے دو۔ جعفر حاضر ہُوا اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ یزیدی کو ڈر پیدا ہُوا کہ مامون جعفر سے کہیں میری شکایت نہ کر دے۔ جعفر چلا گیا تو یزیدی نے پُوچھا کہ میری شکایت تو نہیں کی۔ مامون نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا، " استغفر اللہ! میں ہارون الرشید سے تو کہنے کا نہیں، جعفر سے کیا کہوں گا۔ کیا میں یہ نہیں سمجھتا کہ تادیب و تعلیم سے مجھ کو کس قدر فائدے پہنچیں گے"؟

خلفاء کا دستور تھا کہ دربار میں جو لوگ معتمد اور صاحبِ فضل و کمال ہوتے تھے' اولاد کو اُن کی آغوشِ تربیت میں دے دیتے تھے اور اُنھیں کے اہتمام میں وہ تعلیم اور تربیت حاصل کرتے تھے۔ ہارون نے اسی قاعدے کے موافق مامون کو ۱۸۲ھ میں جعفر برمکی کے حوالے کیا۔ مامون کی قابلیتِ علمی اور عام لیاقتوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ وہ جعفر برمکی کی آغوشِ تربیت میں پلا، جو قابلیتِ وزارت کے علاوہ علوم و فنون میں دست گاہِ کمال رکھتا تھا اور زیادہ تر اسی کی سرپرستی میں ممالکِ اسلامیہ میں فضل و کمال کا رواج ہُوا۔ یزیدی کا بڑا بیٹا محمدؔ بھی، جو نہایت مُتبحّر اور شاعر تھا، مامون کی تربیت پر مامور تھا۔

مامون کو مؤرخوں نے حافظ القرآن لکھا ہے۔ غالباً اسی زمانے میں وہ حافظ ہوا ہو گا۔ بہرحال قرآن مجید کے ختم کرنے کے بعد اس نے نحو و ادب پڑھنا شروع کیا اور وہ مہارت حاصل کی کہ جب کسائی نے ایک موقع پر امتحان لیا اور نحو کے مُتعدّد مسئلے پُوچھے، تو اس نے اس برجستگی سے سوالوں کے جواب دیے کہ خود کسائی کو تعجب ہُوا اور

ہارون نے جوشِ طرب میں سینے سے لگا لیا۔

اس امتحان میں ہارون کا دُوسرا بیٹا امین بھی شریک تھا، جو مامون سے ایک برس چھوٹا تھا اور جس کو اس بات میں مامون سے شرف حاصل تھا کہ اس کی ماں زبیدہ خاتون تھی اور اس اعتبار سے نجیب الطّرفین تھا۔

یزیدی نے مامون و امین کو برجستہ گوئی اور حسن تقریر کی بھی تعلیم دی تھی۔ اِن دونوں کی قابلیت پر یزیدی کو خود تعجب ہوتا تھا اور وہ کہا کرتا تھا کہ "خُلفائے بنی اُمیہ کے لڑکے قبائل عرب میں بھیج دیے جایا کرتے تھے کہ شُستہ بیانی سیکھیں، مگر تم تو گھر بیٹھے اُن سے کہیں زیادہ فصیح اور زبان آور ہو۔ اوّل اوّل اُس نے جمعے کے دن ایک بڑے مجمع میں جو فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا، ایسے پُر تاثیر لہجے میں پڑھا کہ تمام حاضرین کے دِل ہِل گئے اور اکثر لوگ رو پڑے۔ ابو محمد یزیدی نے اس پر ایک قصیدہ لکھا۔ کتاب الاغانی میں یہ قصیدہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ ہارون نے اس صِلے میں یزیدی کو پچاس ہزار درہم عطا کیے۔ فقہ کی تعلیم کے لیے سلطنت کے ہر حصّے سے فُقہا بُلا لیے گئے اور مامون نے ان کے فیضِ صحبت سے ایک ماہر فقیہ کا رُتبہ حاصل کیا۔

حدیث کے فن میں مالک بن انسؒ امامِ وقت تھے اور بڑے بڑے ائمۂ فن، جن میں امام شافعیؒ بھی داخل ہیں، ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ ہارون الرشید نے جب اُن کی خدمت میں درخواست کی کہ "حریم خلافت میں قدم رنجہ فرما کر شہزادوں کو علمِ حدیث پڑھائیں" تو امام مالکؒ نے کہلا بھیجا کہ "علم کے پاس لوگ خود آتے ہیں، وہ دُوسروں کے پاس نہیں جاتا۔" اُنھوں نے اس بات سے ہارون کو اور بھی غیرت دلائی کہ "یہ علم تمھارے ہی گھر سے نکلا ہے، اگر تمھیں اِس کی عزّت نہ کرو گے، تو وہ کیونکر عزّت پا سکتا ہے"؟ اس معقول جواب کو ہارون نے نہائیت خوشی سے تسلیم کیا اور شہزادوں کو حکم دیا کہ امامِ موصوف کی درس گاہِ عام میں حاضر ہوں۔

ہارون الرشید خود بہت بڑا فقیہ اور پایہ شناسِ فن تھا۔ مُوطّا کے پڑھنے کے لیے جو علم حدیث کی نہایت معتبر اور مشہور کتاب ہے، وہ اکثر امام مالک کی خدمت میں حاضر ہُوا ہے، اور چونکہ اس کو اپنی اولاد کی تعلیم کا شروع ہی سے نہایت اہتمام تھا، امین اور مامون بھی اس درس میں اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ ہر چند دار الخلافت بغداد میں جس پایے کے علماء موجود تھے، اس وقت اور کہیں نہ تھے، تاہم ہارون کی خواہش تھی کہ ملک میں اور جو اربابِ فن ہیں، ان کے فیضِ تعلیم سے بھی مامون اور امین محروم نہ رہیں۔ جب وہ کوفے گیا، جو اس وقت فقہ و حدیث کا مرکز تھا، تو وہاں کے تمام محدّثین کو طلب کیا۔ چنانچہ دو شخص کے سوا اور سب حاضر ہُوئے۔ یہ دو بزرگ عبداللہ بن ادریس و عیسیٰ ابن یونس تھے، جنھوں نے اپنے طریقِ عمل سے ثابت کیا امام مالکؒ کے سوا اور لوگ بھی ہیں جو علمِ حدیث کی اصلی عزّت کرتے ہیں۔ ہارون نے حکم دیا کہ مامون و امین خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ابن ادریس نے سو حدیثیں روایت کیں اور جب اسی وقت مامون نے اُن حدیثوں کو سُنا دیا، تو ابن ادریس بھی

اس کی قوّتِ حافظہ اور واقفیت پر عش عش کر گئے۔

علومِ مروجۂ وقت میں سے مامون نے اگرچہ ہر ایک علم میں دستگاہِ مناسب حاصل کی تھی، لیکن خاص فقہ، ادب، تاریخِ ایامِ عرب میں وہ بڑے بڑے ماہرینِ فن کا ہمسر گنا جاتا تھا اور درحقیقت ایک ایسے شخص کو جو بالطبع ذکی ہو، جس نے یزیدی اور کسائی جیسے مجتہدینِ فن سے تعلیم پائی ہو، ایسا ہی یگانۂ فن ہونا چاہیے جیسا کہ مامون تھا۔

مشق

۱ — مامون الرشید کی ولادت کی رات بھی عجیب رات تھی۔ کیوں؟

۲ — مامون الرشید نے اپنے عہد کے کن اہم علوم میں مہارت حاصل کی؟

۳ — حضرت امام مالکؒ اور ہارون الرشید میں جو واقعہ پیش آیا، اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے اور بتائیے کہ اس واقعے سے آپ کیا سبق حاصل کرتے ہیں؟

۴ — مامون اور امین میں باہم کیا رشتہ تھا؟ مصنف نے امین کو کیوں نجیب الطّرفین کہا ہے؟

۵ — درجِ ذیل جملوں کا مفہوم وضاحت سے بیان کیجیے۔

(ا) قضائے الٰہی نے اس بحث کا فیصلہ کر دیا، آپ اطمینان سے سریرِ خلافت کو زینت دیں۔

(ب) مامون کا سن ہی کیا تھا، مگر طباعی اور فطانت کے جواہر ابھی سے چمک رہے تھے۔

(ج) استغفراللہ! میں ہارون الرشید سے تو کہنے کا نہیں، جعفر سے کیا کہوں گا۔

(د) یہ علم تمھارے ہی گھر سے نکلا ہے، اگر تمھیں اس کی عزّت نہ کرو گے، تو وہ کیوں کر عزّت پا سکتا ہے۔

(ہ) ہارون الرشید خود بہت بڑا فقیہ اور پایہ شناسِ فن تھا۔

(و) اسی گفتگو میں خواص مژدہ لائی کہ "مشکوئے معلّیٰ میں وارثِ تاج و تخت پیدا ہوا"۔

(ز) خلفائے بنو اُمیّہ کے لڑکے قبائلِ عرب میں بھیج دیے جایا کرتے تھے کہ شُستہ بیانی سیکھیں، مگر تم تو گھر بیٹھے ان سے کہیں زیادہ فصیح اور زبان آور ہو۔

۶ — الفاظ و تراکیب کے معنی بتائیے اور اُنھیں جملوں میں استعمال کیجیے۔

متنبّہ، سریرِ خلافت، مشکوئے معلّیٰ، مبارک فال، فطانت، معتمد، بالطبع، یگانۂ فن، حریمِ خلافت، فقیہ، مُتبحّر۔

ایک وصیّت کی تعمیل

میرزا فرحت اللہ بیگ

میں مُدت سے حیدر آباد میں ہُوں ۔ مولوی وحید الدین بھی برسوں سے یہاں تھے لیکن کبھی ملنا نہیں ہُوا ۔ انھیں ملنے سے فرصت نہ تھی ۔ مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی ۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے ۔ گزشتہ سال کالج کے جلسہ میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا ۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدر آباد کے سٹیشن پر پہنچا ، تو کیا دیکھتا ہوں کہ سٹیشن کا سٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے ۔ طالب علم بھی ہیں ، ماسٹر بھی ہیں ۔ کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں ۔ کچھ بے ضرورت چلے جا رہے ہیں ۔ کچھ واقعی مہمان ہیں ، کچھ بن بلائے مہمان ہیں ۔ غرض یہ کہ آدھی ریل انھی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے ۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی ۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے گپیں مار رہے تھے ۔

میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے ، بڑے بڑے ڈگ بھرتے ، میری طرف چلے آ رہے ہیں ۔ متوسط قد ، بھاری گٹھیلا بدن ، بڑی سی توند ، کالی سی سیاہ فام رنگت ، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی ، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں ، شرعی سفید پائجامہ ، کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی ، سر پر عنابی ترکی ٹوپی ، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا ۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگا لیا ۔ حیران تھا کہ یا الٰہی ! کیا ماجرا ہے ؟ کیا امیر حبیب اللہ خان اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے ؟ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چُور ہو گئیں ، اس وقت انھوں نے فرمایا " میاں فرحت ! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا ۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے ، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آ کر ملوں ، مگر موقع نہ ملا ۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا بھئی ! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا ، مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا ، افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا بھی لکھتا ۔ " میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون ؟ اور کیا کہہ رہے ہیں ؟ مگر میری زبان کب رکتی ہے ؟ میں نے کہا " مولوی صاحب ! آپ گھبراتے کیوں ہیں ، بسم اللہ کیجیے ،

مر جائیے، مضمون میں لکھ دوں گا۔" کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے معذرت کی، وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہو گئے کہ جس گاڑی میں تو ہے میں بھی اسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ان کا سامان لاکر میرے درجے میں رکھ دیا۔ اِدھر ریل چلی، اور اُدھر اُن کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں، درجہ اول میں ہم تین آدمی تھے۔ بس، مولوی صاحب اور رفیق بیگ۔ رفیق بیگ تو سو گئے۔ ہم دونوں نے باتوں میں صبح کردی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا۔ اصطلاحات زبانِ اُردو پر بحث ہوتی رہی، شعر و شاعری ہوئی، دوسروں کی خوب بُرائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں۔ مولوی عبدالحق کو بُرا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جا کر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کردی۔ پھر اُٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے، پھبتیاں اُڑیں، اس کو بے وقوف بنایا، اس کی تعریف کی۔ ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اُڑی جاتی تھی۔

میں شاعر نہیں ہوں، ہاں بعض دوستوں کی فرمائش سے زبردستی شعر کہتا ہوں، مجھے بڑا تعجب ہوا، جب مولوی صاحب نے کہا "فرحت تو شاعر ہے کیوں اس جوہر کو خاک میں ملا رہا ہے؟ ہو سکے تو کچھ کہہ لیا کر۔" میرے ایک قطعۂ تاریخ سے ایسے خوش ہوئے کہ اُسی وقت اُٹھ قلم دوات نکال وہ قطعہ لکھ لیا، آپ بھی سُن لیجیے، کہتے ہیں نئی طرز کی تاریخ ہے، ہو گی۔ ہم کو تو نہ اس کے لکھنے میں دماغ سوزی کرنا پڑی اور نہ اس کی قدر ہے، ہاں قطعے سے پہلے اس کی شان نزول سُن لیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کے دماغ میں یورپ جانے کے خیالات ہمیشہ چکر لگاتے تھے، پیسہ پاس نہیں، مگر چاہتے تھے کہ ساری دُنیا میں پھریں اور وہ بھی اس طرح نہیں جس طرح امریکہ والے پھرتے ہیں، بلکہ اس طرح جیسے پہلے زمانے کے سیاح پھرتے تھے۔ ادھر کوشش کی آخر سرکار سے منظوری ہو ہی گئی۔ ڈھائی تین برس میں سارا یورپ چھان مارا۔ شمالی افریقہ کے سب ملک دیکھ لیے۔ عراق، عرب، شام، ترکی غرض سیکڑوں ملکوں کی سیر کی۔ آئے اور بڑی دھوم سے آئے۔ وہ نام پیدا کیا کہ خدا سب کو نصیب کرے۔

دوستوں نے مجھ سے تاریخ کہنے کا تقاضا کیا۔ مار مار کر شاعر بنایا۔ تاریخ ہوئی:-

پھر پھرا کر مرے اک دوست سفر سے آئے
بار تاریخ کا ڈالا گیا میرے سر پر
دوستوں کا ہے تقاضا کہ لکھو جلد لکھو
میں بھی شاعر ہوا، اللہ کی قدرت ہے مگر
میرے انکار سے احباب نہ رنجیدہ ہوں
اس لیے لکھتا ہوں تاریخ، بہت ڈر ڈر کر
ایک طائر کو قفس میں تھا خیالِ گلشن
پر سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا، جھکائے ہوئے سر
رحم کچھ آگیا صیاد کے دل میں شاید
ہٹ گیا سامنے سے ایک طرف کھول کے در
در کھلا پایا تو آہستہ سے طائر نکلا
پھر چلا تیر سا گلشن کی طرف مار کے پر
خوب دل بھر کے مزے زمزمہ سنجی کے لیے
خوب دل کھول کے باغوں میں لگائے چکر
بچتا وہ گردشِ افلاک سے آخر کب تک
ہوتا کب تک نہ زمانے کے تغیر کا اثر
آب و دانہ اسے پھر کھینچ کے لایا سوئے دام
باندھے صیاد نے پھر طائر آزاد کے پر
لکھی "فرحت" نے ہے کس زور سے فصلی تاریخ
پھر وہی کنجِ قفس پھر وہی صیاد کا گھر

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں۔ پہلے تو ذرا بند بند رہے لیکن آخر میں کھل گئے۔ میں نے جو رائے اُن کے متعلق قائم کی ہے وہ سُن لیجیے۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اُن میں ظرافت کا مادہ بہت تھا لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ کسی کو بُرا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ اِدھر سے اُدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا جو دل سے اُن کو چاہتا ہو۔ اُن کے علم، اُن کی سمجھ، اُن کی زُود فہمی اور اُن کی طبعِ رسا کی سب تعریف کرتے ہیں لیکن اُن کی طبیعت کے سب شاکی ہیں اور وہ خود بھی اس سے بیزار تھے۔ بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی وہ ٹھوکریں اٹھائی تھیں کہ خُدا کی پناہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصیبتوں نے اتنا اثر کیا، تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نااہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو اُن کے آگ لگ جاتی۔ ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا۔ انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا "اے میاں گدھا ہے، ایک سطر صحیح نہیں لکھتا اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب، ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزار دی۔ اس اخبار کی اڈیٹری کی، اس رسالے کے مینجر ہوئے، سرسید کی خدمت میں سر گاڑی، پاؤں پہیا کیا، اب جو چند روپلی مل رہے ہیں، فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، خبر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے۔" میں نے کہا،

"مولوی صاحب! یہ دُنیا ہے، آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہلِ کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں، جو اللہ نے دیا ہے، بہُت ہے۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ مزے کیجیے۔ بہُت گزر گئی ہے، تھوڑی رہی ہے۔ ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجیے۔"
وہ بھلا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے۔ اُن کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی، نااہلوں کو آرام و آسائش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے، زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا۔ بے نقطنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں اُن کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی اُن کی نگاہ وسیع ہوئی اتنا ہی اُن کا دل تنگ ہُوا، جتنی اُن کے قلم میں روانی پیدا ہوئی، اتنی ہی اُن کی مٹھی بند ہوئی۔ میں اُن کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا، جب اُن کے مُنہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب، آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے، تو اب لکھتے کیوں ڈروں۔ واقعی بڑے کنجوس تھے۔ ہزار روپے کے گریڈ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہُت کچھ مل جاتا تھا۔ مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اس کی صراحت میں آگے چل کر کروں گا۔ ہاں اُن کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے اُن کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اُن کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لیے چھوڑ گئے اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم اُن کے بیٹے نہ ہوئے۔

بہر حال یونہی ہنستے، بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور کا استقبال ہُوا۔ موٹروں میں لد کر اورنگ آباد کالج پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے لگے ہیں۔ خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا ہے۔ منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزہ تھی۔ راستہ کی تکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہو گئی۔ بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا۔ دوسرے روز اُن کا لیکچر تھا۔ طبیعت صاف نہیں تھی۔ پھر بھی بڑے میاں کو جوش آ گیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا، شیروانی نکالی نئی ترکی ٹوپی نکالی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک، نیا پہن، اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ واہ۔ کھڑے ہو کر لیکچر دینے کا دم نہ تھا۔ سٹیج پر کرسی بچھا دی گئی۔ اُنھوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لیکچر پڑھنا شروع کیا۔ میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ سپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہو جاتا ہے مگر مولوی صاحب کے طرزِ ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ اُن کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ

زور تھا، جتنا بولنے میں ہوتا ہے، معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا، مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی، آواز کے اتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے۔ یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لیکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لیکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر زمانے میں سرسیّد مرحوم اپنے اکثر لیکچر انھیں سے پڑھوایا کرتے تھے۔ یا تو یہ لیکچر پڑھتے پڑھتے یہ خود سمجھ گئے تھے یا یہ اُن کی خداداد قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سرسیّد مرحوم نے اس کام کے لیے اُن کا انتخاب کیا تھا۔ غرض کچھ ہی ہو، اس میں اُن کا مدِّمقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اسی روز ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔ "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا مشاعرہ" اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی ساز و سامان، وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ سٹیج کے انتظام ہی کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں۔ آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں، قالین بچھانا، گاؤ تکیے لگانا سامان جمانا، مشعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا اِس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کر کے اس بے چینی کو کم کروں، میں نے کہا "یارو! ذرا جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے، مزا کرکرا ہو جائے گا۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں، تمھارا کام جب ختم ہو جائے تو سیٹی بجا دینا۔ میں اپنی سپیچ ختم کر دوں گا" اتنا کہہ کر میں چٹ باہر پردے کے سامنے آگیا۔ مضمون سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کر دوں۔ جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مؤلف "طبقات شعراء ہند" سے منسوب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ ان ہی کے مکان پر نواب زین العابدین کی مدد سے ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لیکچر میں ابتداءً اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مذاقیہ پیرائے میں بیان کیا۔ اُن کی پھٹی ہوئی جوتیوں، اُن کے خاک آلودہ کپڑوں، اُن کی وحشت زدہ شکل اور اُن کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ گیا۔ پھر اُن کے دہلی آکر تعلیم پانے، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعراء اس میں جمع ہوئے۔ میں اسپیچ

دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا، کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین سلیم کی طرف ہو گیا۔ مجھے تو معلوم نہیں، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنی پیدا کر لیے۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے، کتابوں کا بیوپار کرتے تھے، لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحید الدین کے والد تھے۔ ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی۔ اب جو ہے وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟" مولوی صاحب کے تاؤ کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اونٹتے رہے۔ خدا خدا کر کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں، مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے۔ کہنے لگے "فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے۔ کریم الدین کو میرا باپ بنا دیا" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں؟ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا، پان بنا کر دیا، سگریٹ پیش کیا۔ جب جا کر ذرا نرم پڑے اور واقعہ بیان کیا "مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہو سکتی تھی۔ اوّل تو اس مذاق کا یہ موقع ہی کیا تھا۔ دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے۔ کہاں کے تھے، دلی آئے بھی تھے یا نہیں۔ کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے" کہنے لگے "تو گھڑی گھڑی ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا" میں نے کہا "مولوی صاحب! سپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بخود اسی طرح ہو جاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کر لیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے" بہرحال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟" یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔ کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جل کر کہتے "جی ہاں میرے والد تھے۔ کچھ آپ کا دینا آتا ہے"

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا۔ جب کچھ لکھتا، پہلے اُن کو جا کر سناتا، بڑے خوش ہوتے، تعریفیں کرتے، دل بڑھاتے، ہائے اُن کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا، مگر خالی ڈھنڈار۔ ساٹھ روپے مہینہ کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے، نہ بال نہ بچہ نہ نوکر نہ ماما۔ میں گیا باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا، آواز آئی "کون"، میں نے کہا "فرحت"، اسی وقت کُرتا پہنتے ہوئے آئے۔ دروازہ کھولا، اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے۔ دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے اس پر میلی چاندنی ہے۔ دو چار چوہا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین

چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھے کنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں، ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجیے، مولوی صاحب کے گھربار کا یہ خلاصہ ہے، مولوی صاحب بیٹھے ہیں، سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے۔ چائے بن رہی ہے۔ خود پی رہے ہیں دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے چائے بنا نمک کے ڈلے کو ڈال دو ایک چکر دے، نکال لیا۔ بس سارے دن اُن کا یہی شغل تھا، گھر میں برتن ہی نہیں تھے کھانا کیسے پکتا پکاتا۔ خبر نہیں کہاں جاکر کھا پی آتے تھے۔ کبھی میں گیا، دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے۔ سمجھ گیا مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں؟ کہنے لگے "نہیں بھئی، میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے صرف چائے پر گزران ہے۔" تم مان لو، میں تو نہیں مانتا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُن کو کھاتے اور خُوب کھاتے دیکھا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیوں کر کھاتے، پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ما ما رکھنا پڑتی، سامان منگوانا ہوتا۔ لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ، نون کا خرچ، غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنالی پی لی، اِدھر اُدھر گئے، پیٹ بھر لیا۔ گھر آئے، بان کی کھری چارپائی پر لوٹ ماری۔ چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔ ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے۔ کسی کے پاس بھی ہو، سونے میں بڑا آرام دے گی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے' ان کے بھی یار، دوست، شاگرد غرض کوئی نہ کوئی اُن کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے' ان کو پونچھ پانچھ، صاف کر، جمع کرتے جاتے، انھی کاغذوں پر لکھتے، غزلیں لکھتے، غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انھیں کاغذوں پر ہوتا۔ خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر لکھتے کیوں کر تھے۔

مولوی صاحب دُنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق اُن کی رائے معلوم کروں، مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال' گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے اُن کی رائے معلوم ہے۔ اگر اُن ہی الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوجداری ہو جائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے الفاظ دماغ میں اُتارتے کہ باید و شاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اس شاعر کا۔ بھلا ایک ایک لفظ کے لیے کون دیوان ڈھونڈتا بیٹھے۔ اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں۔ ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے اور اس اصل کے کیا معنی ہیں۔ اس بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہو گیا۔ الفاظ کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، انھیں اصولوں کو وہ اُردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا اس وقت سب کی یہی رائے ہے کہ ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی، مگر وہ اُردو کے لیے بنے تھے اور اُردو ان کے لیے۔ خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں، جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے۔ مولوی صاحب کیا مرے، زبان اُردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا، اس حصے میں اڑواڑ بھی لگانی مشکل ہے۔

مشق

۱۔ مصنف نے مولوی وحید الدین سلیم کی وضع قطع کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲۔ مصنف نے مولوی وحید الدین سلیم کے کردار اور شخصیت کے کون کون سے پہلو نمایاں کیے ہیں ؟ خلاصہ بیان کیجیے۔

۳۔ کیا مصنف نے مولوی وحید الدین سلیم کے مزاج اور کردار کے کمزور پہلوؤں کو چھپانے کی کوشش کی ہے ؟
اگر نہیں تو انھیں کس انداز میں پیش کیا ہے ؟

۴۔ درست جواب پر نشان لگائیے۔

(ا) مولوی وحید الدین سلیم انگریزی پر عبور رکھتے تھے۔ ہاں ۔ نہیں

(ب) مولوی وحید الدین سلیم انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ ہاں ۔ نہیں

(ج) مولوی وحید الدین سلیم کے والد کا نام مولوی کریم الدین تھا۔ ہاں ۔ نہیں

(د) مولوی وحید الدین سلیم بہت کنجوس تھے۔ ہاں ۔ نہیں

(ہ) مولوی وحید الدین سلیم بہت نرم خو، وضع دار اور دوست دار تھے۔ ہاں ۔ نہیں

(و) مولوی وحیدالدین سلیم کے مخالفوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ہاں - نہیں

(ز) مولوی وحیدالدین سلیم کا رہن سہن بہت شاہانہ انداز کا تھا۔ ہاں - نہیں

(ح) مولوی وحیدالدین سلیم لکھی ہوئی تقریر کو بھی خطابت کے انداز میں پڑھتے تھے۔ ہاں - نہیں

(ط) مولوی وحیدالدین سلیم مزاج برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہاں - نہیں

(ی) مولوی وحیدالدین سلیم ظریف الطبع شخصیت تھے۔ ہاں - نہیں

(ک) مولوی وحیدالدین سلیم کی ظرافت رکاکت میں بدل جاتی تھی۔ ہاں - نہیں

(ل) مولوی وحیدالدین سلیم نے تمام عمر عیش و آرام میں گذاری۔ ہاں - نہیں

۵ - سیاق و سباق کے حوالے سے وضاحت کیجیے۔

(ا) بھئی مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا، مرنے کے بعد بھی اس کا نام زندہ کر دیا، افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا۔

(ب) میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ گھبراتے کیوں ہیں، بسم اللہ کیجیے، مر جائیے مضمون میں لکھ دوں گا۔"

(ج) اِدھر ریل چلی، اور اُدھر اُن کی زبان چلی۔

(د) ان میں ظرافت کا مادہ بہت تھا لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

(ہ) جتنی اُن کی نگاہ وسیع ہوئی اتنا ہی اُن کا دل تنگ ہوا، جتنی اُن کے قلم میں روانی پیدا ہوئی اتنی ہی اُن کی مٹھی بند ہوئی۔

(و) مولوی صاحب کیا مرے، زبانِ اُردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا، اس حصے میں اڑواڑ بھی لگانی مشکل ہے۔

۶ - اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

اڑواڑ، حاشیۂ خیال، باید و شاید، غیر مطبوعہ، شکر خورا، دار الترجمہ، صراحت، بے نقط سنانا، زخم ہرے ہونا، طبع رسا، رکاکت، یورش کرنا۔

۷ - درج ذیل عبارت میں مناسب جگہوں پر وقف کی ضروری علامات لگائیے۔

وہ بھی جاڑوں کی ایک شام تھی اس دن گہرے دھوئیں جیسے بادلوں سے پھوار سی موہوم سے انداز سے گر رہی تھی یہ پھوار متروکہ کوٹھی کی کچی چھت اور صحن میں بے آواز طریقے پر گرتی رہی اور جذب ہوتی گئی لیکن پرانے انداز کے لمبے سے سُرخ برآمدے کی کائی لگی منڈیروں اور گروں پر بھی پھوار گرتی تو سمٹ سمٹ کر بوندیں بن جاتیں اور پھر نیچے پھیلے ہوئے پانی کے ننھے ننھے گڑھوں میں ٹپ سے گر جاتیں کہنے کو فرخندہ خانم کرسی

پر بیٹھیں ایم اے نفسیات کے آخری سال کا آزمائشی پرچہ حل کر رہی تھیں لیکن اُن کا سارا وجود برآمدے کے ماتھے پر سے ٹپکتی ہُوئی پانی کی بوندوں میں جیسے نہار رہا تھا ان کا خیال یہ تھا کہ سردی میں صاف ہوا سے دماغ تروتازہ ہو جاتا ہے اس لیے کوئی حرج نہیں کہ جسم پرانے کوٹ میں ٹھٹھرتا رہے لیکن دماغ نفسیاتی داؤ پیچ سمیٹنے کے لیے آمادہ ہو سکے۔

۸ - سبق سے مرکباتِ توصیفی تلاش کر کے لکھیے۔

۹ - اپنے کسی دوست کا خاکہ لکھیے۔

۱۰ - اس سبق میں مصنف میرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے دو مضمونوں کا حوالہ دیا ہے ایک کا نام ہے "دلی کا آخری یادگار مشاعرہ" اور دوسرے کا عنوان ہے "نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری کچھ اُن کی زبانی" دونوں مضامین کے کتابچے لائبریری سے حاصل کر کے پڑھیے۔

پھر وطنیّت کی طرف

مولانا صلاح الدین احمد

پاکستان کے قیام سے پہلے اسلامیانِ ہند کے دل جس جذبے سے سرشار تھے، وہ وحدتِ ملّت کا جذبہ تھا اور اگرچہ اس جذبے نے ہمارے فکر و شعور سے وطنیّت کو یکسر مٹا دیا، لیکن یہی جذبہ بالآخر ہمارے قومی وطن کے قیام کا باعث بنا۔ تاریخ کا یہ ایک حیرت انگیز مُعمّا اور ایک گہرا راز ہے، جسے پوری صحت اور قطعیت سے حل کر لینا ممکن نہیں۔ بہرحال جہاں تک ہماری زندگی کے موجودہ تقاضوں کا تعلق ہے، آج اس بات کا فیصلہ کر لینا نہ صرف موزوں بلکہ ضروری ہے کہ ہمارا قومی نصب العین کیا ہے؟ یا اس کے حصُول کا سیدھا راستہ کون سا ہے؟ اور ہماری وطنیّت اور ملّت اس کی کس حد تک معاون یا مخالف ہو سکتی ہے؟

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے، اسلامی ہند میں جذبۂ ملّت کا فروغ اور پھر اس فروغ کے نتیجے میں ایک قومی وطن کی آفرینش بظاہر ایک تاریخی معمّے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان کے قیام سے کم و بیش رُبع صدی پیشتر اس مردِ عظیم کے افکار، جس نے ہمیں پاکستان کا تصوّر دیا، وطن اور وطنیّت کے استخفاف کو مسلسل اپنا محور بنا رہے تھے لیکن جب مفکّرِ اسلامؒ نے اپنے شاعرانہ الہامات کی موجودگی میں ایک وقفۂ قلیل کے لیے مسلمانانِ ہند کی عملی سیاسیات کی طرف اپنی توجّہ مبذول کی، تو انھیں شمال مغربی ہندوستان نے ایک اسلامی وطن کے قیام کی دعوت دی۔ یہاں میں اِس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ یہ دعوت جمرود سے لے کر راس کماری تک تمام اسلامیان ہند کے لیے تھی یا صرف ان ہی اقطاع کے باشندوں کے لیے، جو دریائے سندھ سے لے کر دریائے جمنا تک آباد تھے اور وہ خواب جسے ٹیپو سلطانؒ نے بھی دیکھا اور عبدالحمید[1] ثانی نے بھی، جمال الدین افغانیؒ نے بھی دیکھا اور خود مفکّرِ اسلام علامہ اقبالؒ نے بھی، کس تعبیر کا شرمندہ ہونے والا تھا؟ لیکن ایک بات بالکل صاف اور عیاں ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ملّت اور مقاصد ملّت کے امکاناتِ فروغ کے سلسلے میں جب شاعرِ مشرق نے جذبات سے افکار کی طرف انحراف کیا، تو اسے مومن کی ترک تاز کے لیے اس جہان کی وسعتیں اور اس کے سفینے کے سفر کے لیے بحر امکان کی ناپید اکناریاں بے کار اور بے معنی نظر آئیں اور اُس نے اپنے تاریخی خطبے میں مُسلمانوں کو اس ملک[2] کے شمال مغربی

---

[1] عبدالحمید ثانی: سلطان ترکی [2] پورا برصغیر پاک و ہند مراد ہے۔ (مؤلفین)

کونے میں ایک قومی وطن کی تاسیس و تشکیل کی دعوت دی ۔ شاعر آسمان کی بلندیوں اور وُسعتوں سے اُتر کر زمین کے ایک تنگ ٹکڑے کی حدود میں ملت اور اس کے مفاد کو محصور و محدود کرنے پر نہ صرف آمادہ ہو گیا، بلکہ اسی میں اس کو اس کی نجات بھی نظر آئی ۔

زمین آخر زمین ہے، اور ہمارے تخیّل کی ہزار پروازیں اور ہماری آرزوؤں کی ہزار رفعتیں بھی اُسے آسمان نہیں بنا سکتیں اور حقیقت کی دُنیا میں ہمیں آسمان سے بہت زیادہ ضرورت بھی زمین ہی کی ہے تاکہ آسمان کی بادشاہت زمین پر قائم ہو اور اللہ تعالیٰ کی اِس زمین پر اس کے فرماں بردار بندے مُتصرّف ہو کر اُسے اپنا وطن بنائیں اور اس وطن کی حفاظت میں، اگر ضرورت پڑے، تو اپنی جانیں، اپنا مال اور اپنی اولاد قربان کر دیں ۔

اقبالؒ نے جب ہمیں پاکستان کا تصوّر دیا تو یہ بلا شبہ اس کے آفاق گیر تصورِ ملت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، لیکن اس کی رجعت ایک حقیقت پرستانہ رجعت تھی ۔ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو اپنے تحفظ اور اپنے فروغ کے تقاضے پُورے کرنے کے لیے کسی بحرِ بے پایاں یا کسی آسمانِ بے کراں کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ ایک ایسے خطۂ زمین کی حاجت تھی، جس میں سما کر یا سِمٹ کر، پھیل کر یا بٹ کر اُسے ایک آزاد اسلامی زندگی بسر کرنی تھی ۔

خُداوند تعالیٰ کے فضل و احسان سے ہماری یہ ضرورت ایک حد تک پُوری ہُوئی ۔ یہاں اس بحث میں اُلجھنا بے سُود ہو گا کہ ہم میں سے کتنے اِس نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ مند ہُوئے، لیکن جس قدر بھی بہرہ مند ہو سکے، اُن کے لیے نجات و فلاح کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ وطن کی والہانہ محبّت کے مرغزار میں ہو کر نکلتا اور اس فوزِ عظیم کی طرف بڑھتا ہے، جو مومن کی منزلِ مقصود ہے ۔

جب اپنے ملّی مفاد کی حفاظت اور اپنے ملّی مقاصد کے فروغ کے لیے ہم نے ایک وطن حاصل کر لیا ہے، خواہ وہ ہم سب کے لیے کافی ہے یا ناکافی، تو منطقی طور پر ہمارے لیے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اس کے تحفُّظ اور اس کے فروغ کو تمام دیگر فرائض پر ترجیح دیں ۔ کیونکہ نہ صرف ہمارے اعمالِ حَسَنہ، نہ صرف ہمارے مقاصدِ ملّی، بلکہ خود ہماری ہستی، ہماری جانیں اور ہمارے جسم، ہمارے گھر بار اور ہمارے مواقع اور ہمارے امکانات اس کی سلامتی سے وابستہ ہیں ۔ اگر ہمارا وطن قائم رہے گا، تو ہمیں خدمتِ دین اور تعمیرِ ملت کے موقعے بھی ملیں گے ۔ ہم اعلائے کلمۃُ اللہ بھی کر سکیں گے اور حقوقِ انسانیت بھی ادا کر پائیں گے ۔ لیکن اگر خُدا نخواستہ وطن کو ضعف پہنچا یا ملک پر آفت آئی، تو نہ ہم بچے رہیں گے اور نہ ہماری مسلمانی اور خاکم بَدَہن، ملک کا زوال ملت کا زوال بن جائے گا ۔

جہاں تک اِس برِعظیم کا تعلق ہے، قیامِ پاکستان کے بعد ہمارا محاذ یکسر بدل چکا ہے۔ اب وَطَن اور مِلّت کے مفاد مُتضاد نہیں رہے، بلکہ ہم آہنگ ہو گئے ہیں اور ایک کا فروغ، دُوسرے کی ترقّی کا ضامن ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم پر ایک نئی ذمّے داری بھی عائد ہو گئی ہے اور وہ ہے ایک کروڑ غیر مسلم پاکستانیوں کی ذمّہ داری۔ ظاہر ہے قیامِ پاکستان میں اُن کی کسی قسم کی آرزوؤں نے حصّہ نہیں لیا، بلکہ وہ خود بخود اس کے حِصّے میں آ گئے ہیں۔ اُنھیں مفید شہری بنانے کے لیے اور اُن کے اور اپنے درمیان ایک بنیادی ہم آہنگی اور ہم مقصدی کے لیے لازم ہے کہ ہمارے سامنے ایک مشترکہ نصب العین ہو، جس کے تقدّس سے نہ انھیں مجالِ انکار ہو اور نہ ہمیں یارائے انحراف۔ ظاہر ہے کہ یہ نصب العین وطن پروری اور وطن دوستی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی نصب العین اُن کی وفاداری کا ضامن اور مملکت کی سلامتی کا سہارا ہو گا اور اسی وجہ سے ملک کی اکثریت اور اَقلیت ہاتھوں میں ہاتھ دیے آگے بڑھیں گی اور ملک کی فلاح و بہبود میں برابر کا حصّہ لیں گی۔

اب کہ ہم آزاد ہیں، ہماری وطن دوستی ہمارے مِلّی روابط پر غالب نہ آئے گی اور نہ انھیں نقصان پہنچائے گی اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم شاعرِ اسلام کی اس آرزو کو بر لانے کے لیے ہمیشہ سربکف رہیں گے۔

ایک ہوں مسلم، حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

مشق

۱۔ مضمون میں مصنف نے جن اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے، ان کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

۲۔ پاکستان کا قیام برِصغیر کے مسلمانوں کے لیے کیوں ضروری تھا؟

۳۔ ٹیپو سلطانؒ، سلطان عبدالحمید ثانی، جمال الدین افغانیؒ اور علامہ اقبالؒ کس مشترک تصوّر کے مبلّغ تھے؟

۴۔ "وطنی قومیت" اور "ملّت" میں کیا فرق ہے؟

۵۔ ملّتِ اسلامیہ کے اتحاد کے ضمن میں پاکستان کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

۶۔ مضمون کے سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اقتباساتِ ذیل کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

(ا) "زمین آخر زمین ہے، اور ہمارے تخیّل کی ہزار پروازیں اور ہماری آرزوؤں کی ہزار رفعتیں بھی اسے آسمان نہیں بنا سکتیں اور حقیقت کی دُنیا میں ہمیں آسمان سے بہت زیادہ ضرورت بھی زمین ہی کی ہے، تاکہ آسمان کی بادشاہت زمین پر قائم ہو اور اللہ تعالیٰ کی اس زمین پر اس کے فرماں بردار بندے متصرّف ہو کر اُسے اپنا وطن بنائیں اور اس وطن کی حفاظت میں،

اگر ضرورت پڑے، تو اپنی جانیں، اپنا مال اور اپنی اولاد قربان کر دیں"۔

(ب) "خداوند تعالیٰ کے فضل و احسان سے ہماری یہ ضرورت ایک حد تک پوری ہوئی۔ یہاں اس بحث میں الجھنا بے سود ہوگا کہ ہم میں سے کتنے اس نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ مند ہوئے، لیکن جس قدر بھی بہرہ مند ہو سکے، اُن کے لیے نجات و فلاح کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ وطن کی والہانہ محبت کے مرغزار میں ہو کر نکلتا اور اُس فوزِ عظیم کی طرف بڑھتا ہے، جو مومن کی منزلِ مقصود ہے"۔

۷۔ ذیل کے الفاظ سے سابقے اور لاحقے الگ کر کے اپنی کاپی میں لکھیے اور پھر ان کے ساتھ الفاظ لگا کر تین تین نئے الفاظ بنائیے اور انھیں جملوں میں استعمال کیجیے۔

آفاق گیر، بہرہ مند، ناکافی، بے معنی، مرغزار، ذمہ داری، ہم آہنگی، وطن پروری، غیر مسلم۔

۸۔ ذیل کی عبارت کو درست کر کے لکھیے۔

"اب کہ ہم آزاد ہے، ہمارا وطن دوستی ہمارے ملی روابط پر غالب نہ آئے گا اور نہ انھیں نقصان پہنچائے گا اور جہاں تک ہماری تعلق ہے ہم شاعرِ اسلام کے اس آرزو کو بر لانے کے لیے ہمیشہ سر بکف رہیں گی"۔

۹۔ ان میں سے مذکر اور مونث استعمال ہونے والے الفاظ الگ الگ کیجیے۔

جذبہ، وحدت، ملت، تاریخ، معمّا، زندگی، تقاضا، نصب العین، وطنیت، وطن، دعوت، وقفہ، بحث، گنجائش، سفر، بلندی، ضرورت، محبت، خدمت، آفت۔

۱۰۔ جمع کے واحد اور واحد کے جمع لکھیے۔

جذبہ، مخالف، افکار، الہامات، وقف، اقطاع، اعمال، فرائض۔

نام دیو مالی

(ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

نام دیو، مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کا مالی تھا ذات کا ڈھیڑ، جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن، کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچ ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں، جیسی اونچی ذات والوں میں ؎

قیس ہو کوہکن ہو یا حالیؔ
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ ہی کے احاطے میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی، اس میں سے چمن صاف نظر آ رہا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔

بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مُڑ مُڑ کر دیکھا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا دیکھتا جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت کام ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی، یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا مگر اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچے کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا اُن سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے، جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی

پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا، باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اس میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اُس کے لگائے ہُوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہُوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی شناخت ہوگئی تھی۔ خاص کر بچّوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دُور دُور سے لوگ اُس کے پاس بچّوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لاکر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لیے بلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا، مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہ لیتا۔

وہ خود بھی بہُت صاف ستھرا رہتا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا، کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتّھر پڑا رہے۔ روشیں با قاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑنا بہارنا صُبح و شام روزانہ، غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ عبدالرحیم خان خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہُوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہُوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے، لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہُت کم ہُوئی۔ کنوؤں اور باؤلیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ میں آفت ٹوٹ پڑی۔ بہُت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہُوئے تھے جیسے بہُت دن کے بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا وہ دُور دُور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسّر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کر لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی، لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس

کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچّوں کو پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا حق دار نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو، ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوشگوار آب وہوا میں باغ لگانے کا شوق ہُوا تو یہ کام ڈاکٹر سراج الحسن ناظم تعلیمات کو تفویض ہُوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغبانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب وتعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے، مدّت سے ویران اور سنسان پڑا تھا۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکاڑ سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز، شاداب اور آباد نظر آتا ہے اب دُور دُور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں اور سیر وتفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے۔ اسے مقبرے سے شاہی باغ لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگران کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے کیسے۔ ٹوکیو سے جاپانی، طہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اُپج تھی۔ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے فنِ باغبانی کی نہ کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سندیا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سیندھی شراب پیتے۔ یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دفعہ نہ معلوم کیا بات ہُوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہُوئی، سب مالی بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہُوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلر اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔

وہ بہُت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ وہ دن رات برابر کام کرتا رہا۔ اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں

بہُت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچّھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا اور غریبوں کی مدد کرتا۔ وقت پر کام آتا۔ آدمیوں، جانوروں، پوُدوں کی خدمت کرتا، لیکن کبھی اُسے یہ احساس نہ ہُوا کہ وہ نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آیا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے؟ اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں؟ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کہ کندن ہو جاتا ہے۔

حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا، اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

مشق

۱ - نام دیو مالی کے اوصاف اختصار سے لکھیے۔

۲ - ذات پات کے امتیاز کے بارے میں مصنف کا کیا نظریہ ہے؟ ۳ - سیاق و سباق کے حوالے سے ان جملوں کی وضاحت کیجیے۔

(ا) درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے۔ نہ پہنچ سکتا ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کہ کندن ہو جاتا ہے۔

(ب) تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

(ج) نیکی اسی وقت نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

۴ - ان الفاظ اور مرکبات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ معنی واضح ہو جائیں - استعداد، کندن ہو جانا، منکسر مزاج، اُپج، قضا کا سر پر کھیلنا، موروثی، تلف ہو جانا، سینچنا۔

۵ - جملے درست کیجیے - (ا) - باغ میری نگرانی میں تھی۔ (ب) مالی اپنی کام میں مگن رہتی۔

(ج) ہم سب مل کر پودوں کو پانی دیتا۔ (د) باغ میں بہُت سے پھل دار درخت ہے۔

تقریر اور تدبیر

میاں بشیر احمد

بظاہر تقریر اور تدبیر کچھ اُلجھا ہُوا سا عنوان معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مقابل میں مثلاً تقدیر اور تدبیر ایک سیدھی سی بات ہے، جس سے ہم سب بخوبی آشنا ہیں۔ صدیوں بقولِ حضرت داغؔ ہماری قوم کا اعتقاد رہا کہ ؎ تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی بگڑی ہُوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

اس پر ہم بڑے چین سے تکیہ کیے رہے، زمانے کے نامُساعِد حالات میں یہی آرام دہ سہارا بنا رہا یعنی اپنی تکلیفوں اور غموں کا ہم مدّتوں یہی علاج کرتے رہے کہ ہم نے انھیں لاعلاج سمجھ لیا۔ مَلِکُ الشعُرا ذوقؔ نے شاید یہ کہہ کر ہمیں گویا نا امیدی میں آرام پسندی کا سبق دیا۔

؎ امّید ہو گئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لیے

یہ حالت تھی کہ ترجمانِ حقیقت نے ہمیں آ کر جھنجھوڑا اور لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے بھول جانے والوں کو غیرت دلائی۔ اقبالؒ نے اپنے پیغامِ خودی میں پھر خودداری کا سبق پڑھایا اور بتایا کہ

؎ تقدیر شکن قوّت باقی ہے ابھی اس میں ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

لیکن ایک گری ہُوئی قوم کا سنبھلنا آسان کام نہیں اور آسان کیوں ہو؟ کوئی اچھا کام بالعموم آسان نہیں ہوتا۔ کم از کم ایسے حالات میں، جن سے ہم دوچار ہیں، کوئی واقعی اچھا کام آسان ہو نہیں سکتا۔

پرانی عادتیں آسانی سے نہیں چھوٹتیں۔ چنانچہ تقدیر و تدبیر کے سلسلے میں اب ہماری قوم بجائے مؤثر تدبیریں اختیار کرنے کے اکثر تدبیر پر تقریریں کرتی رہتی ہے۔ یہ ہے میرے عنوان "تقریر اور تدبیر" اختیار کرنے کی شانِ نزول، اور میں بھی اکثر دوستوں کی طرح یہی کہہ رہا ہوں "چہ تدبیر اے مسلماناں" باقی کہ "من خود نمی دانم" بلکہ "من آنم کہ من دانم" فقط رسمی طور پر کہہ دینا، اقبالؒ کے پیغامِ خودی کے بعد اب ذرا مشکل ہو گیا ہے۔ ہمارا ضمیر ہمیں کوستا ہے۔

مدت ہوئی، میں نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے ایک سالانہ جلسے میں پاکستان کے اخلاقی نصب العین پر ایک تقریر کی تھی۔ اس پر میرے ایک عزیز نے مجھ سے کہا کہ سب باتیں درست ہوں گی، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کا اور ہمارا اور سب کا اِن اچھی باتوں پر عمل کہاں تک ہے؟

اسی لیے جب اس دفعہ کارکنانِ انجمن نے مجھ سے تقریر کی فرمائش کی، تو میں نے پہلے ذرا تامّل

کیا اور خیال کیا کہ بقولِ جناب[1] ہمایوں ع " ناصح جو بے عمل ہو کسی کام کا نہیں"۔ لیکن پھر اس بارے میں ذرا غور کرنے پر کم از کم مصلحت اسی میں سمجھی کہ میں اپنے لیے تقریر کرنے کو باعثِ سعادت سمجھوں اور جو کچھ بُرا بھلا ہو سکے، لکھ لوں اور کہہ دوں۔ آخر میں بھی تو اسی قوم کا ایک ناچیز فرد ہوں، جس کی بابت کہا جاسکتا ہے کہ شاید یہ دُنیا کی سب سے زیادہ باتونی قوم ہے۔ ہم یقیناً یَقُولُونَ مَا لَا یَفْعَلُونَ کا بہترین یا کہیے کہ بدترین نمونہ ہیں۔ جتنے ادیب اور شاعر اور مقرر ہماری قوم نے پیدا کیے (یا) کم از کم جتنے نام نہاد انشا پرداز اور قافیہ پیما اور دُھواں دھار تقریریں کرنے والے اور باغ و بہار تحریریں لکھنے والے اس مملکتِ خداداد کے بے عمل عوام و خواص نے پیدا کیے ہیں، اُن کی نظیر ڈھونڈے سے مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ اس قوم کے دفترِ کارکنان میں ہر روز گفتار کے غازیوں کی بڑے زور شور سے بھرتی ہوتی رہتی ہے۔

لیکن غلطی اور بے انصافی ہوگی، اگر اس بارے میں ہم مُبالغے سے کام لیں اور سب کو ایک ہی رسّی سے لٹکا دیں۔ سب کی گفتار ایک سی نہیں، کیونکہ سب کا کردار ایک سا نہیں۔ اسی انجمنِ حمایتِ اسلام کے سٹیج پر ایسی ایسی ہستیاں مصروفِ کلام رہی ہیں، جنھوں نے ہماری پس ماندہ قوم میں اپنے زندہ و تابندہ لفظوں سے از سرِ نو جان ڈال دی ہے اور اُسے عمل کے ایک نئے راستے پر لگا دیا ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس پر چلیں یا نہ چلیں۔ آخر ہم کیوں نہ سُنیں اور سمجھیں اور دل میں جگہ دیں اقبالؒ کے اس پیغام کو کہ

ے کام اپنا ہے صبح و شام چلنا ۔۔۔ چلنا چلنا مدام چلنا
اور ے جنبش سے ہے زندگی جہاں کی ۔۔۔ یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس راہ میں مقام بے محل ہے ۔۔۔ پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں ۔۔۔ جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

دِقت یہ ہے کہ اقبالؒ کو بھی ہم نے پڑھ پڑھ کے ختم کر دیا، قوالیاں بنا بنا کر بے معنی سا کر دیا، اسے محض اپنی تفریح کا ذریعہ بنا لیا۔ لیکن اس پر بھی ع " نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے" اور پھر " دِگرگوں ہے جہاں"، بھلا زمانے کی "گردشِ تیز" اور ہر" ذرّے میں غوغائے رُستاخیز" یہ اب کیسے اور کب تک چین سے بیٹھنے دیں گے؟ وقت کی ضربیں اب ہمیں جگا کر اور اکسا کر ہی رہیں گی۔ ہم اب اپنی سُستی اور بے اعتنائی کو پہلو میں لے کر دیر تک اونگھ نہ سکیں گے۔ کہتے ہیں کہ پاکستان بغیر ہماری کوششوں

---

[1] جسٹس شاہ دین ہمایوں، مصنف کے والد گرامی ——— (مؤلفین)

کے یوں ہی بن گیا۔ سو اس پر "اللہ دتا" اور "اللہ رکھا" کی پھبتی کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ پھبتیاں کچھ اتنی درست اور فیصلہ کن نہیں۔ بغیر کوشش کے کچھ بھی سرانجام نہیں ہوتا، کم از کم کوشش کا کچھ جزو اس میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ باوجود ہزار کوتاہیوں کے قوم میں ایک جوہر تھا، جس نے غیروں کی چوٹ پر کچھ شرر پیدا کر دیے اور پھر حالات نے ہمیں ایک رہنما دے دیا، جس نے اِن شعلوں سے ایک شمع روشن کرلی۔ وہ جھلملا رہا ہے، لیکن خُدا کے فضل و کرم سے ابھی موجود و منوّر ہے۔ "ہوا ہے گو تند و تیز لیکن"۔ یہ دیا ابھی کسی نہ کسی طرح جل رہا ہے اور اُسے ہماری مساعی سے، ہمارے خونِ جگر سے جلنا اور جلتے رہنا ہے۔

کہتے ہیں کہ کچھ دیر سے حالات سازگار نہیں اور ہم لوگ ؏ "ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے"۔ لیکن آخر ترستے رہنے سے تو کبھی کوئی امید بر نہیں آسکتی۔ آخر ہمیں میں سے کوئی اُٹھ کر ؏ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" پر عمل پیرا ہوگا۔ اس ملک میں چہ میگوئیاں بہت ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہماری قوم تو درست ہے اور ہمارے عوام "خالص سونا" ہیں اور جتنا بھی قصور ہے، وہ ہمارے لیڈروں کا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ سب خرابی اہلِ حکومت کی ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک خاص گروہ ہے، جس میں سے کبھی کچھ لوگ گدّی کو سنبھال لیتے ہیں اور کبھی کچھ، یعنی انھیں اپنی گدّیوں سے واسطہ ہے اور قوم کی بہبُود سے وہ یکسر بے نیاز ہیں؟ اور کیا باقی ساری قوم بھولے بھالے اور بھلے لوگوں پر مشتمل ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے عوام میں بعض بڑی اور لاجواب صفات ہیں۔ وہ بڑے دل والے ہیں، سادہ لوح ہیں، کسی نصب العین پر جان تک دینے کی ہمت وقت آنے پر اُن میں اُبھرتی ہے۔ یہ درست ہے، لیکن صبح سے شام تک دُنیا کے مختلف پیچیدہ حالات کو نپٹانے اور سُلجھانے کے لیے بہت سی اور باتوں کی بھی ضرورت ہے۔ اگر ہم ایک قوم ہیں تو ہمیں منظم ہونا ہے جمہوری طور پر۔ کسی نہ کسی جمہوری یا نیم جمہوری طریقے پر منظم ہونا ہے۔ کسی ڈکٹیٹر شپ کے انتظار میں نہ تو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ سکتے ہیں، نہ اس کے لیے محض دست بدعا ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح صحیح قسم کے "حاکموں" کا انتخاب کرنا ہے۔ اگر اب تک ہمیں یہ نصیب نہیں ہُوئے، تو قصور ہمارا بھی ہے۔ جیسا راجا ویسی پرجا سے اب زیادہ درست یہ ہے کہ جیسی پرجا ویسا راجا، جیسی روح ویسے فرشتے، جیسا مُنہ ویسا تھپّڑ۔ لیکن آخر کب تک ہم یونہی اپنوں کے تھپّڑ کھاتے جائیں گے یا ایک دُوسرے کو تھپّڑ مارتے رہیں گے؟

کیا مل کر کام نہیں ہو سکتا؟ کیا ہمیں اسی میں مزا آتا ہے کہ ایک اُبھرے اور ایک گرے اور جو اُبھرے وہ دوسروں کو گرا کر ہی اُبھرے؟ یہ کیا ضرور ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری ذہنیت پست ہے۔ ذہنیت جو صدیوں سے غلامی میں پست ہوگئی، تو پھر وہ بلند نہیں ہُوئی۔ بعضوں کا

خیال ہے اس کا علاج آزادی ہے، صحیح قسم کی آزادی، جس کے چند ضروری اجزاء ہیں، افلاس سے رہائی، ایک بہتر معیشت اور بہتر معیارِ زندگی۔ یہ ہے طبقاتی تقسیم کی جکڑ بندی سے رہائی اور پھر بیماری سے چھٹکارا، بہتر حفظانِ صحت اور حفظِ ماتقدم —— انفرادی ہمت اور اجتماعی منصوبہ بندی وغیرہ۔ جب تک یہ میسّر نہ ہوں، نام نہاد آزادی بے معنی ہے۔ دُوسروں کا خیال ہے کہ سب خرابیوں کی جڑ جہالت ہے۔ تعلیم عام کر دو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بعضوں کو یقین ہے کہ ہمارے زوال اور مسلسل زوال کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے دین کا انحطاط۔ ہماری بُری حالت دینی احکام کی بجا آوری سے قطعاً اچھی ہو سکتی ہے۔ ایک اور بات کہ ہر شخص کو پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہیے، پھر سب کچھ آپ سے آپ درست ہو جائے گا۔ غرض جتنے ڈاکٹر اور حکیم ہیں اتنے ہی جُدا جُدا اُن کے نسخے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی کے پاس قومی مرض کے دُور کرنے کی اکسیر دوا موجود نہیں کیونکہ قومی مرض ایک نہیں، وہ بہُت سے امراض کا مجموعہ ہے اور اس کا علاج ایک نہیں، بہت سے ہیں، جو کچھ بیک وقت ہونے چاہییں اور کچھ یکے بعد دیگرے۔

اس سے ہمیں پریشان نہ ہونا چاہیے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کاش! ہماری بیماری ایک ہوتی، تو اس کا علاج بھی آسان ہوتا۔ انسان ایک بے جان، بے روح کل نہیں، جس کا ایک پرزہ یا چند پرُزے بگڑ گئے، تو اُن کی جگہ نئے پرُزے ڈال دیے اور سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ وہ ایک جیتی جاگتی، ہزاروں کام کرنے والی، سینکڑوں آرزوئیں رکھنے والی ہستی ہے، جس کی زندگی کے معنی ہی ہیں تنوّع سے لطف اندوزی اور اختلاف میں تعاون کی تلاش اور کثرت میں وحدت کی جستجو۔ زندگی ایک لق و دق صحرا نہیں، جسے بس ایک نظر میں دیکھ لیا۔ وہ ہے ایک دُور دراز تک پھیلا ہوا گھنا جنگل، کسی لامتناہی کوہستان پر، جس میں اُونچ نیچ ہے اور جس میں سینکڑوں نظارے ہیں بُرے اور بھلے۔ اور اس گھنے جنگل کی کاٹ چھانٹ بھی ہو سکتی ہے اور اس میں باغ اور چمن اور کیاریاں اور روشیں بنائی جا سکتی ہیں۔ یوں اس کا حُسن ہر موسم میں نئے سے نیا بنتا رہتا ہے، اس کی بوقلمونی ہی میں اس کی دلکشی ہے۔

ع اے ذوقؔ، اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

پس اختلاف سے گھبرانا نہ چاہیے، خواہ وہ قدرت کے نظاروں میں ہو، خواہ انسانی فطرت میں اور خواہ انسانی جماعتوں اور گروہوں میں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ باغِ زندگی میں ہر پودے کو نشوونما کا، ہر کلی کو پھُول بننے کا اور ہر پھُول کو لہلہانے اور اپنی خوشبو پھیلانے کا موقع ملنا ازبس ضروری ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ باغ کا باغبان کوئی فرعونِ بے سامان نہ ہو بلکہ وہ "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ" کا چلتا پھرتا پیکر ہو۔ وہ اپنے آپ کو ایک قومی کارکن تصوّر کرے اور دُوسرے کارندوں کو اپنا حلقۂ ملازمین نہ سمجھے۔ کام کرنے

والے بڑے اور چھوٹے عملاً ایک دُوسرے کے بھائی بھائی ہوں، وہ حاکم اور محکوم، گورنمنٹ اور رعیت نہ ہوں۔ وہ اپنے آپ کو اور دُوسروں کو انسان اور ہم جنس جانیں اور عملاً ایک دُوسرے سے ہمدردی کا سلوک کریں۔ یہی انسانیت ہے اور یہی صحیح مُسلمانی۔

کیا یہ ہوگا اور کب ہوگا اور کیسے؟ اور اسے کون کرے گا؟ یقین جانیے کہ اس میں سے کچھ نہ کچھ آپ خود ضرور کر سکتے ہیں۔

ع کچھ بس میں نہیں، تو کچھ ہے بس میں اپنے

(۲۷ مارچ ۱۹۵۵ء کو انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پیش کیا گیا ایک خطبہ)

مشق

ا۔ کالم ۱ میں اِس سبق میں سے چند جُملے دیے گئے ہیں۔ کالم ۲ میں ان کے بارے میں سوالات ہیں۔ آپ ان سوالات کے مختصر جوابات دیجیے۔

کالم ۱ جُملے	کالم ۲ سوالات
i۔ کوئی اچھا کام بالعموم آسان نہیں ہوتا۔	۱۔ اس ضمن میں آپ کی کیا رائے ہے؟
ii۔ پرانی عادتیں آسانی سے نہیں چھوٹتیں۔	۲۔ اگر یہ درُست ہے تو کیوں؟
iii۔ دِقت یہ ہے کہ اقبالؒ کو بھی ہم نے پڑھ پڑھ کے گویا ختم کر دیا۔	۳۔ کیا آپ اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں؟
iv۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے عوام میں بعض بڑی اور لاجواب صفات ہیں۔	۴۔ ہمارے عوام میں کون کون سی بڑی اور لاجواب صفات پائی جاتی ہیں؟
v۔ قومی مرض ایک نہیں، وہ بہت سے امراض کا مجموعہ ہے۔	۵۔ آپ کی نظر میں ہم کن بڑے بڑے قومی امراض میں مبتلا ہیں؟
vi۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کاش! ہماری بیماری ایک ہوتی تو اس کا علاج بھی آسان ہوتا۔	۶۔ اس جملے کی روشنی میں بتائیے کہ مصنف نے ہمارے قومی امراض کا کیا علاج بتایا ہے؟

۲ - درج ذیل عبارت کو غور سے پڑھیے اور بتائیے کہ اس میں کس چیز کو کس چیز سے تشبیہ دی گئی ہے ؟

” زندگی ایک لق و دق صحرا نہیں جسے بس ایک نظر میں دیکھ لیا۔ وہ ہے ایک دُور دراز تک پھیلا ہُوا گھنا جنگل، کسی لامتناہی کوہستان پر، جس میں اُونچ نیچ ہے اور جس میں سینکڑوں نظارے ہیں۔ بُرے اور بھلے “۔

۳ - دُرست تلفظ کے لیے ان الفاظ کے حروف پر اعراب لگائیے۔

لامتناہی، مبالغہ، گروہ، نصب العین، تنوع، بوقلمونی، اختلاط، مرض منظم، مملکت۔

۴ - مضمون کے سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ذیل میں جن اقتباسات کی نشاندہی کی گئی ہے، آپ اُن کا مطلب وضاحت سے بیان کیجیے۔

(ا) ” جتنے ادیب اور شاعر اور مقرّر ہماری قوم ....

.... گفتار کے غازیوں کی بڑے زور شور سے بھرتی ہوتی رہتی ہے “۔

(ب) ” پس اختلاف سے گھبرانا نہ چاہیے ....

.... اور اپنی خوشبو پھیلانے کا موقع ملنا ازبس ضروری ہے “۔

۵ - ” قومی تعمیر و ترقی اور ہمارے فرائض “ —— اس عنوان پر ایک مضمون لکھیے جو کم از کم دو سو الفاظ پر مشتمل ہو۔

۶ - آپ ذیل کے اقتباس کو غور سے پڑھیے اور اس میں مناسب مقامات پر وقف کی علامتیں لگائیے۔

ابا جان گزشتہ برس ہم ریڈیو اور ٹیلی وژن پر خفیہ دولت کے بارے میں اکثر سنتے رہے ہیں یہ کیا چکر ہے بیٹا بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ٹیکس سے بچنے کے لیے اپنی بیشتر دولت چھپائے رکھتے ہیں انھیں اس کا قطعاً احساس نہیں کہ انھوں نے جو کچھ کمایا ہے وہ اسی ملک کے طفیل ہے وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ اُن کی آمدنی میں یہاں کے غریب عوام بھی شریک ہونے پائیں اسی لیے حکومت کو ان کی خفیہ دولت باہر لانے کے لیے مختلف اقدامات کرنا پڑے ابا جان نے جواب دیا۔

۷ - ان الفاظ و مرکبات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

نامساعد حالات، خودداری، گفتار کے غازی، بے اعتنائی، چہ میگوئیاں، اختلاط، تنوع، لق و دق صحرا، فرعونِ بے سامان، بُوقلمونی۔

۸ - جمع کے واحد اور واحد کے جمع لکھیے۔

ملازمین۔ کارکن۔ مرض۔ حکیم۔ طبقہ۔ قافیہ۔ اعتقاد۔ قوم۔ شعرا۔

سائنس اور مذہب کے فاصلے

ڈاکٹر سید عبداللہ

اس وقت ایک اہم مسئلہ، مشرق اور مغرب دونوں میں، عام انسان کے لیے شدید توجہ اور بحث کا مرکز بنا ہُوا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ سائنس کی برق رفتار ترقی کی صُورت میں دین و مذہب بلکہ خود انسان کا مستقبل کیا ہے؟ ہمارے یہاں کا ایک عام آدمی سائنس کی ترقی کو ان ایجادات کے پیمانے سے ناپتا ہے جو ٹکنالوجی نے ہمیں دی ہیں اور ان میں بعض بلکہ بیشتر ہم سب کے لیے باعثِ راحت و سُہولت بھی ہیں، مگر سائنس کی ترقی کا ایک رُخ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ فکرِ انسانی پر اثر انداز ہو کر معاشرت، کلچر اور سوسائٹی کے رویّوں پر بھی گہرا اثر ڈال رہی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر دُنیا بھر میں مجلسی نظام درہم برہم ہو رہے ہیں، اقدار کے سلسلے بکھر رہے ہیں اور جو چیز کل تک اچھی تھی، آج اس کا درجہ یا تو پست ہو رہا ہے یا بالکل فرسودہ اور نیچ سمجھی جا رہی ہے۔ ان ہی میں اخلاقی اور مذہبی اقدار بھی شامل ہیں اور ایٹمی توانائی کے معجزوں اور مرّیخ و قمر پر انسان کی یلغاروں نے تو سب کو ششدر اور حیرت زدہ کر رکھا ہے۔

ان حالات میں مغرب کے ادیبوں میں (اور مشرق میں بھی) کبھی کبھی یہ فریادِ تشویش سنائی دیتی ہے کہ سائنس اگر ہلاکت کے سامان یونہی بڑھاتی رہی تو معلوم نہیں انسان کا کیا ہوگا؟ جوہری توانائی کے ان ذخیروں کے ہوتے ہُوئے جو سائنس دانوں نے تیار کر کے سیاست دانوں کے ہاتھ میں دے دیے ہیں، دیوانگی و رقابت اور جنگی جنوں کی ایک خفیف سی لہر بھی اس جہانِ آب و گل اور اس کے کوہ و صحرا کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے، تو ایسے حالات میں ہمارا کیا ہوگا؟ ہمارے بال بچوں کا کیا ہوگا؟ ہمارے بال روموں اور کلبوں کا کیا ہوگا؟ ہمارے مے خانوں اور ہمارے مے کدوں کا کیا ہوگا؟ غرض ابنِ آدم اپنی ہی ذہانت سے پیدا کی ہُوئی ایجادات کے ہاتھ سے پریشانی کے عالم میں ہے اور اس پریشانی کا پتا ان فلسفیانہ نظریوں اور ادبی دبستانوں سے چلتا ہے جو اس وقت یورپ اور امریکہ میں بھکے بھکے خیالات اور بکھری بکھری باتوں کے ذریعے انسانی ذہن و قلب کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ یُوں ظاہر میں لبوں پر مسکراہٹ بھی ہے — رسالہ "ٹائم" اور رسالہ "لائف" میں ہر عورت ہنستی دکھائی جاتی ہے اور ہر مرد فرحان و شاداں معلوم ہوتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ دل سب کے پریشان ہیں اور ہر شخص اس خوفناک ساعت سے ڈر رہا ہے جس کا خدشہ سیاست اور سائنس کی یکجائی نے پیدا کر دیا ہے۔

ہم مشرقی لوگ تو شاید صرف تقلید کے جرم میں مارے جائیں گے، پھر بھی مسئلہ سب کے لیے قابلِ غور ہے اور مغرب کی طرح مشرق کے اہلِ فکر کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے۔

میں چند روز ہُوئے (ایک) رسالہ پڑھ رہا تھا، اس میں پروفیسر ایرک ویل (ERIC WEIL) نے یورپ کے سیاسی اور فلسفیانہ فکر پر لکھتے ہُوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فلسفہ اور سیاست دونوں اس اطمینان کی بحالی میں ناکام ہو چکے ہیں، جس کی انسان کو ہر حال میں ضرورت ہے۔ لہٰذا اب ایسا ادب پیدا کرنا چاہیے جو انسان کو قدیم ابتدائی انسان کی سی خوشیوں سے مالامال کر دے ــــــ چنانچہ متھ (MYTH) اور فکشن (FICTION) کو ان سب پریشانیوں کا علاج بتایا ہے، جن میں اس وقت یورپ اور امریکہ کا انسان مبتلا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ مقالہ نگار مذکورہ نے دین کو قابلِ اعتنا کیوں خیال نہیں کیا، مگر میرے نزدیک وجہ ظاہر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مغربی ذہن ایک زمانہ ہُوا یعنی کئی صدیاں ہُوئیں، مذہب سے بیزار ہو کر مذہب کو اپنے نظام سے خارج کر چکا ہے ــــــ مگر جنابِ من! ہم تو ابھی تک دین کو مانتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی دین ہمارے لیے سرمایۂ اطمینان ہے اور ہم سائنسی لحاظ سے ترقی یافتہ نہ ہونے کے باوجود اِن قلبی پریشانیوں میں مبتلا نہیں جن کی ہولناک چیخ مغربی ادبوں میں اس وقت سنائی دیتی ہے! لہٰذا کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مشرق سے مغرب کے نام اپنا پیغام پہنچائیں اور اس سوال کا شافی جواب دیں کہ انسان کا مستقبل، سائنس کی ترقی کے باوجود، چند شرطوں اور پابندیوں کے ساتھ محفوظ ہی نہیں بلکہ شاندار ہو سکتا ہے اور اگر ان شرطوں پر ایمانداری سے عمل کیا جائے تو انسان کی یہ ارضی جنت ہمیشہ ہمیشہ آباد اور پھلی پھولی رہ سکتی ہے، تاآنکہ خود خدائے حیّ و قیوم کو کوئی اور جنت آباد کرنے کے لیے اس کو مسمار کرنے کا خیال نہ آئے۔

انسان کے مستقبل کے لیے میں جن شرطوں کا ذکر کر رہا ہوں، وہ یہ ہیں کہ مشرق و مغرب کے انسان یہ مان لیں کہ خُدا ہے، اس کا رسول برحق ہے، جزا و سزا کا اصول عدل و نصفت ہی کے لیے نہیں، انسانی خوش حالی اور ترقی کا بھی ضامن ہے اور آخر میں یہ بھی کہ قیامت ضرور آئے گی اور موت کے بعد بھی اعمال کا حساب ہوگا! ــــــ اِن اصُولوں کا عقیدہ اور عمل توازن کی ضمانت بن سکتا ہے۔ آپ کہیں گے ہائیں! فلسفے اور سائنس کی باتوں میں یہ مُلّایانہ پیوند ــــــ ؟ میں کہتا ہوں آپ کا طعنہ قبول، مگر راہِ نجات یہی ہے اور غور و فکر کے راستے سے بھی اِسی نتیجے پر پہنچا ہُوں کہ سائنس اور دین کا ملاپ ضروری ہے، اخلاق اور دین کا ملاپ ضروری ہے۔ ادب اور دین کا ملاپ ضروری ہے ــــــ اپنی دلیل کو طول کیوں دوں، کل زندگی اور دین کا ملاپ،

فرد و اجتماع دونوں کی خوشحالی اور ترقی کے لیے اور دنیا و مافیہا کے سُود بہبُود کے لیے ناگزیر ہے۔
خوش قسمتی سے دُنیا میں اس وقت ایک ایسا ملک اور ایک ایسی قوم بھی ہے جس کے کل نظامِ زندگی کی بنیاد دین پر قائم ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اس قوم میں کمزوریاں بھی ہوں گی، اس کے کچھ لوگ دین کا نام مصلحت کی خاطر یا ریاکاری سے لیتے ہوں گے۔ ان میں بعض متشکک ہوں گے اور بعض بے عمل — مگر یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس قوم نے اس عقل پرست اور دین دشمن دُنیا کے اندر جو دین کو ایک کارِ فضول اور روحانیت کو ایک خیالِ باطل سمجھتی ہے، کسی شرم و حجاب کے بغیر اپنے اس محکم عقیدے کا اعلان کر ہی دیا ہے کہ ہمارا کل نظامِ زندگی دین پر قائم ہے اور خدا کی اس زمین پر انسانوں کی بادشاہت نہیں، خُدا کی بادشاہت ہے۔ یہ للہ الملک کی وہ روشن تفسیر ہے جس کی اشاعت کا کام اس چھوٹے مگر عظیم ملک سے لیا جانے والا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

میں پُورے یقین و اطمینان کے ساتھ عرض کرتا ہُوں کہ اگر یہ چھوٹی سی قوم یہ بات سمجھ لے کہ دُنیا کے فکری رویّوں کو درست کر کے ان کے ذہن و نظر اور عمل میں دین و اخلاق کی مدد سے توازن پیدا کرنا اس کا فرض ہے تو مجھے حق الیقین ہے کہ دُنیا کے سب کج رویے اور سب غلط نظریے درست ہو سکتے ہیں — میں جس قوم کا ذکر کر رہا ہوں، آپ سمجھ ہی چکے ہوں گے کہ اس سے مراد خود آپ اور آپ کی قوم ہے۔ پروفیسر چشتی نے علامہ اقبالؒ کا قول نقل کیا ہے کہ "مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے"۔ حضرت علامہؒ کے ارشاد کی صداقت میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ حضرت علامہؒ نے علم ہی کو نہیں بلکہ خود سیاست اور زندگی کو مشرّف بہ اسلام کرنے کی تلقین کی ہے — اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت آ گیا ہے کہ اَدب، سائنس، سیاست اور عملی زندگی سبھی کو مشرّف بہ اسلام کیا جائے تاکہ ہم خود بھی اُن کے بے توازن رجحانات سے بچ سکیں جو ہم میں مغرب اور امریکہ کے راستے بڑی سُرعت کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں۔

اِس مقصدِ عظیم کے لیے ہمیں اپنے اَدب کا بھی محاسبہ کرنا ہو گا اور اپنی عام فکری زندگی کا بھی — اور اس بات کو بھی اچھی طرح متعیّن کرنا ہو گا کہ دین اور سیاست کے ایک ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اور جب ہم دین و سیاست کی یکجائی کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں سیاست سے کیا مُراد لیتے ہیں؟ اور جب ہم دین اور علم اور اقدارِ جدید کے امتزاج کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ کہ اسلام کو فرنگی لباس پہنا دیا جائے یا فرنگی ذہن کو مُسلمان بنا دیا جائے؟ یقیناً حضرت علامہ کا مقصد یہ تھا کہ زمانے کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے، نہ یہ کہ اسلام کو زمانے کے کج نظریات کے سانچے میں ڈھال دیا جائے۔

بہرحال یہ بحث الگ ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ توازن پیدا کرنے کا کام ہونا چاہیے۔ یہ آپ ہی کا کام ہوگا کہ آپ پہلے علم اور دین کو ایک جگہ بیٹھنے کا موقع دیں، اس کے بعد غور و فکر کر کے دین اور زندگی کی یکجائی کے لیے راستے ہموار کریں اور ان ہموار راستوں پر اپنے نتائجِ فکر اور ریاضتوں کی شمعیں روشن کریں تاکہ سب لوگ، کسی روک ٹوک کے بغیر بڑھتے چلے جائیں اور اپنی منزل کو پالیں۔ اس کے لیے طلبہ کو میرا ایک ہی مشورہ ہے اور وہ یہ کہ اس سائنسی اور فلسفیانہ فکر اور علم سے بخوبی واقف ہوں جو بڑی تیزی کے ساتھ دُنیا بھر میں پھیل رہا ہے —— ہم اس کے بغیر نہ علم کو مسلمان بنا سکیں گے، نہ زندگی کو، نہ سیاست کو اور نہ ادب کو توازن کے راستے پر لا سکیں گے۔

(تعلیمی خطبات مرتبہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری)

مشق

۱ - اس سبق کے مطابق مشرق و مغرب میں کون سا اہم مسئلہ عام انسان کے لیے شدید توجہ اور بحث کا مرکز بنا ہُوا ہے؟

۲ - مصنف نے مذکورہ مسئلے کا کیا حل بتایا ہے؟

۳ - مصنف کے خیال میں دین اور سیاست کے ایک ہونے کا کیا مطلب ہے؟

۴ - موجودہ ذہنی اور فکری افراتفری میں علوم اسلامیہ کے فارغ التحصیل طلبہ پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟

۵ - اقتباساتِ ذیل کا مفہوم اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیجیے کہ مشکل الفاظ و تراکیب کی وضاحت بھی ہوجائے۔

(ا) میں پُورے یقین اور اطمینان کے ساتھ ....

.... تو مجھے حق الیقین ہے کہ دُنیا کے سب کج رو یے اور سب غلط نظریے درست ہو سکتے ہیں؟

(ب) انسان کے مستقبل کے لیے .... ادب اور دین کا ملاپ ضروری ہے۔

۶ - درجِ ذیل جُملوں میں خط کشیدہ الفاظ کے بارے میں بتائیے کہ وہ قواعد کی رُو سے کیا ہیں؟

(i) مسئلہ یہ ہے کہ سائنس کی برق رفتار ترقی کی صُورت میں دین و مذہب بلکہ خود انسان کا مستقبل کیا ہے؟

(ii) مغرب کی طرح مشرق کے اہلِ فکر کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے۔

(iii) رسالہ "ٹائم" اور رسالہ "لائف" میں ہر عورت ہنستی دکھائی جاتی ہے اور ہر مرد فرحان و شاداں معلوم ہوتا ہے۔

(iv) ہمارا عقیدہ ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی دین ہمارے لیے سرمایۂ اطمینان ہے۔

(v) مجھے حق الیقین ہے کہ دُنیا کے سب کج رویے اور سب غلط نظریے درست ہو سکتے ہیں۔

۷ - ذیل میں دیے گئے الفاظ کے متضاد بتائیے اور انھیں جُملوں میں استعمال کیجیے۔

حق، دیوانگی، پست، سزا، کج، توازن، دُنیا، طویل۔

کتبہ

غلام عباس

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہُوئی، قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہُوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دُور دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عمومًا کمروں کی چار دیواروں ہی میں محدود رہتی ہے، مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے، ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہُت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت، درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے، مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں پانی پڑا تھا، بخارات اُٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا، جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹتے ہُوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو مہینے کے شروع کے صرف پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی ان ہی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلاف معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچّوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھا لی تھیں اور اُوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی بس بے فکری ہی بے فکری تھی، گھر میں کچھ اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی اس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہُوئیں۔ ان میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹینٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ، غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجے اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان

کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار، آدھی آستینوں کی قمیص، خاکی زین کی نکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگ دار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے منہ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے۔ ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس اُمید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے، ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں اُن کا کوئی حل سوچا جائے۔ مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کے کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انھیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انھیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض من چلے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کاندھے پر۔ گریبان کھلا ہُوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انھوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تربتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بدقطع سوٹ پہنے، اس گرمی میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں چلے آ رہے تھے۔

گو اِن میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر لب ولہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تُلے ہُوئے تھے، اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اُکساتی تھی بلکہ یہ کہ اُنھیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ باہم بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہُوئے تھے اور عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس ہٹرک کے آثار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا اور کند استروں سے متواتر ڈاڑھی مونڈتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں کی جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ کے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں تھا۔

ایک تانگے کی سواری میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کی

بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گرداگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُر لطف تماشا تھا۔ شریف حسین لیکچر بازحکیموں، سنیاسیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والے سائینوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے فوٹو گرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا، سیر دیکھتا، اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی، مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو اُن کی صورت اِس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا اُن کا کوئی حصّہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بے کار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گلدان، ٹیبل لیمپ، گھڑیاں، جلی ہُوئی بیٹریاں۔ چوکھٹے، گراموفون کے کل پرزے، جراحی کے آلات، ستار، بھس بھرا ہرن، پیتل کے لم ڈھیک، بدھ کا نیم قد مجسمہ ....

ایک دکان پر اس کی نظر سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اُکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اُٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا، قیمت دریافت کی۔

تین روپے! کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اسے اس کی ضرُورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

کیوں حضرت چل دیے؟ آپ بتائیے کیا دیجیے گا؟

وہ رک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہُوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا دام اس قدر کم بتاؤ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکاندار کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

"ہم تو ایک روپیہ دیں گے،" یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے مہلت ہی نہ دی۔

"اجی سنیے تو۔ کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں .... اچھا لے جائیے"

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصّہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اُٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے

تو اس سودے کو منسوخ کر دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک کی ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا مگر دو سال کی سعئی لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آ چکا تھا۔ مگر اس سنگ مرمر کے ٹکڑے نے اس کے خیالوں میں ہلچل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے دفتر جاتے دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہُوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بڑی چابک دستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں پر چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہُوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہُوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہُوا دیکھا ہو۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہُوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبے پر سے اخبار کو اُتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اس کو لپیٹ دیا تھا اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے۔ مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا، شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کے کتبے کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اُتار پھینکا اور نظریں کتبے کی دل کش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی

نکالی، قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے، جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبے کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصّہ مکان میں دو کوٹھڑیاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبے کو اسی بے کواڑ الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبے پر پڑتی۔ اُمیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتیں۔ افسر کی ایک نگاہ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا، نہ کھیل تماشوں میں حصّہ لیتا۔ رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا۔ مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہُوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبہ نہ گرا دے اسے وہاں سے اُٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اس کے صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبے کو بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہُوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بے کار صابن دانیاں رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ

دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نصیب ہوتی ہے۔ کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا جس سے بچّوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اُٹھانی پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبے کی یاد تک اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانت داری، پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجۂ اوّل کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اُسے یہ عہدہ ملا اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی اور اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کاٹھ کی پیٹی سے کتبے کو نکالا صابن سے دھویا پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہُت کٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہُوئے کلرک سے دگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے بہُت سا اُن کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا اس کا دل بُجھ جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے۔ ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے ...... ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے .....

مگر جب تین مہینے گزرے تو نہ تو اس کلرک نے چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی اور نہ ہی بیمار پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے حامل تھے۔ تھوڑی سی خوشحالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ بدتر معلوم ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا، نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں

بیٹھ کر دہ سکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبے کے گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لیے لڑکے نے اسے اُٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصہ میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں کبھی بے کواڑ الماری میں بھی تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے اُوپر، تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ ایک دفعہ کسی نے اُٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے ہُوئے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی، دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ اُٹھا کر دھویا، پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس جگہ وہاں کاغذی پھُولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہُوا بدنما معلوم ہوتا تھا مگر اب کاغذی پھولوں کے سُرخ سُرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اُٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہُوئے پورے بیس برس گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آگیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوشحالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو۔ تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات ایک آہ دم بھر میں اُن تصورات کو اُڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم، اس کے بڑھتے ہُوئے اخراجات، پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نوکریوں کی تلاش۔ یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب ملا کر کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بخوبی گزر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رَونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور وہ زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اُٹھا۔ گرم

گرم لحاف سے نکلا تھا، پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اُس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہُوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہُوئے ایک بوری میں اسے وہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبے پر باپ کا نام دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سُوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا۔ اس نے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سے ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

مشق

۱۔ اس افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔ ۲۔ افسانہ "کتبہ" کا مرکزی خیال لکھیے۔

۳۔ مصنف نے مختلف کلرکوں کی جو وضع قطع بیان کی ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۴۔ کچھ کلرک ہر روز فائلیں ساتھ گھر کیوں لے جاتے تھے اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا تھا؟

۵۔ کلرک غیر زبان میں گفتگو کی کوشش کیوں کرتے تھے؟

۶۔ سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل کی وضاحت کیجیے۔

(ا) مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھاگئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اُسے محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اُسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

(ب) سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا ...... ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلط تھے۔

(ج) اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

(د) تھوڑی سی خوشحالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی بدتر معلوم ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی، افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہ راست پر لے آئے۔

(ہ) افسر کی ایک نگاہِ کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

گھر سے گھر تک

احمد ندیم قاسمی

حاجی مُقتداء احمد کے دیوان خانے میں قدم رکھتے ہی شیخ نورُالزماں کی بیوی عشرت خانم، اُن کی بیٹی ہُما اور بیٹے وَقار کا سارا رُعب داب صابن کے جھاگ کی طرح آناً فاناً غائب ہوگیا۔ یہ لوگ جس کار میں حاجی صاحب کے ہاں آئے تھے وہ اتنی لمبی تھی اگر ہوائی اڈے پر کُھلے دروازوں کے ساتھ کھڑی ہوتی تو لوگ اُسے طیارہ سمجھ بیٹھتے۔ حاجی صاحب کی گلی میں مڑتے ہُوئے ڈرائیور کو اسی لیے خاصی دقّت ہُوئی تھی۔ پھر یہ کار جتنی لمبی تھی اتنی ہی خوبصورت اور چمکیلی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر عام آدمی کا ایکا ایکی جی چاہتا تھا کہ اسے چھُونا اور محسوس کرنا چاہیے۔ مگر فوراً خیال آتا تھا کہ اس ٹھاٹھ کی کار کو چھُونا یقیناً خلافِ قانون ہوگا، اور پولیس پکڑ کرلے جائے گی

کار حاجی مُقتداء احمد کے مکان کے سامنے رُکی تو باوردی ڈرائیور نے اُتر کر کار کے باقی تینوں دروازے کھولے۔ عشرت خانم، ہُما اور وَقار پھُول میں سے بھنوروں کی طرح برآمد ہوئے۔ پھر ڈرائیور نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ تینوں دروازے تڑاخ تڑاخ بند کیے تو گلی کے اِس سرے سے اُس سرے تک کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہُوئی عورتوں اور آدھی لٹکتی ہُوئی لڑکیوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ ڈرائیور بائیں بازو کو ہوا میں لہرا کر کلائی کو آنکھوں کے قریب لایا اور گھڑی میں وَقت دیکھا۔ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر مُونچھیں مروڑنے لگا۔

حاجی مقتداء احمد کی بیوی نورالنساء نے دروازے پر عشرت خانم، ہُما اور وَقار کا استقبال کیا، اور کار کی طرف یوں دیکھا جیسے بچے پیسٹری کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر جب تینوں مہمان حاجی صاحب کے دیوان خانے کا ریشمی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہُوئے تو پائیدان پر ذرا دیر کو یوں کھڑے رہ گئے جیسے آگے قدم بڑھایا تو بے ادبی کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔

سب سے آگے عشرت خانم تھیں۔ اُنھوں نے قالین پر قدم رکھا تو ڈگمگا گئیں، جیسے پھسلنے سے بچی ہیں۔ پلٹ کر اُنھوں نے ہُما کی طرف دیکھا اور شلوار کے پائنچوں کو ذرا سا اُٹھا کر صوفے کی طرف بڑھیں جیسے تالاب میں اُترنے چلی ہیں۔ ہُما اور وَقار پر بھی کم و بیش یہی عالم گزر گیا۔ نورالنساء نے سلیپر پائیدان پر اتار دیے، اور ایک ڈگ بھر کر تخت کے پاس کھڑی ہوگئیں۔ سب

اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگے تو وقار ایک قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس پلش میں لپٹے ہُوئے ایک مونڈھے پر دربان کی طرح بیٹھ گیا۔

نُورالنساء چونک کر بولیں:

"اے ہے وقار میاں، یہ کیا کر رہے ہو؟ اے بہن عشرت خانم اسے سمجھائیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے، کہ وہیں مونڈھے پر ٹک گیا۔ اُٹھو میاں اُٹھو۔ صوفے کس لیے رکھے ہیں؟"

عشرت خانم نے وقار سے کہا:

"سُن رہے ہو میاں! تمھاری خالہ جان کیا کہہ رہی ہیں؟"

وقار کچھ اس طرح چل کر صوفے کی طرف گیا جیسے ایک ایک سیڑھی چھوڑ کر زینہ اُترا ہے۔ اس کے بعد تکلّفات شروع ہُوئے۔ تہذیب برتی جانے لگی، موسم کی بوالعجبیوں کا ذکر چلا، پھر نُورالنساء اٹھیں:

"ہائے میں نے معصُومہ کو تو بتایا ہی نہیں کہ تمھاری خالہ جان آئی ہیں۔"

وقار جو دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا، بائیں ٹانگ کو دائیں ٹانگ پر رکھ کر اور ہُما کی طرف دیکھتے ہُوئے یوں مُسکرایا، جیسے کہہ رہا ہے۔ "دیکھیے باجی، انھیں منع کر لیجیے۔"

ہُما سرسراتے ہُوئے ریشم کے لباس کو سنبھالتی ہُوئی اُٹھی اور مسکرا کر بولی، "آپ تشریف رکھیے خالہ جان، معصُومہ کو میں لے آتی ہوں۔"

نُورالنساء فوراً بولیں:

"نہیں نہیں ہُما بیٹی۔ تم بیٹھو، میں نوکروں سے چائے لگانے کو بھی تو کہہ دوں۔"

نُورالنساء سلیپر پٹخاتی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو ہُما بولی:

"دیکھا اماں! میں نہ کہتی تھی؟"

"اسی لیے تو میں آتی نہیں تھی۔" عشرت خانم بولیں۔ "سمجھ میں نہیں آتا، حاجی صاحب نے اتنی بہُت سی دولت کہاں سے بٹور رکھی ہے؟"

"غالیچہ دیکھیے جیسے سمندر کا جھاگ ہے۔" ہُما نے ہاتھ بڑھا کر غالیچے میں انگلیوں کی پوریں ڈبو دیں۔ "پاؤں رکھو تو تھاہ نہ پاؤ۔ ایک ہزار کا تو ہوگا۔"

"ایک ہزار کا؟" وقار پہلی بار بولا۔ "کمال کرتی ہیں باجی۔ دس ہزار کہیے۔"

"دس ہزار کا اگر صرف یہ غالیچہ ہے تو اس دیوان خانے کا پورا سامان ایک لاکھ سے کم کیا ہوگا؟"

عشرت خانم نے صوفے پر گھوم کر پورے دیوان خانے پر نظریں دوڑائیں۔
"ایک لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے، مُنہ میں سماتی ہے۔ جیب میں رکھو تو پھٹ کر نیچے جا پڑے۔"
"آہستہ بولو" ہُما نے آہستہ سے کہا، "جب لڑکیوں کو دیکھنے آتے ہیں، تو آہستہ بولتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہر پردے کے پیچھے کھڑا کوئی تمہاری باتیں سُن رہا ہے۔"
ہُما جو دروازے کے قریب والے صوفے پر بیٹھی تھی، چمکتے ہُوئے پردے کو چُھو کر کہنے لگی:
"خالص ریشم کے تو پردے ہیں" پھر وہ پردے کو ذرا سا جھٹک کر بولی۔ "یہ دیکھیے ذرا سی شکن جو پیدا ہوتی ہے وہ پانی کی لہر کی طرح آخر تک چلی جاتی ہے۔ یہ دیکھیے، یہ دیکھیے" ہُما نے پردے کو دو تین بار جھٹکا۔
"اے رہنے دے" عشرت خانم نے سرزنش کی "کیا کر رہی ہے، پردہ گر پڑے گا" پھر دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے پردے گنتی ہُوئی بولیں "ایک، دو، تین، چار، پانچ اور چھ۔ اکٹھے چھ پردے ہیں ایک جیسے۔"
"کچھ نہیں تو چھ سو کے تو یہی ہوں گے" ہُما بولی۔
"لیجیے اور سنیے" وقار تڑپ اٹھا "باجی تو کمال کر رہی ہیں، دو ہزار سے کم کے نہیں ہوں گے۔ لکھوا لیجیے مجھ سے۔"
"صوفہ دیکھیے بالکل نئے فیشن کا ہے" ہُما نے تبصرہ جاری رکھا "تپائیوں پر رکھے ہُوئے عجائبات کو دیکھیے وقار، منٹل پیس پر وہ جو ہرن رکھا ہے وہ مٹّی کا ہے کہ لکڑی کا؟"
وقار نے ہرن کی طرف جوہری کی طرح دیکھتے ہُوئے کہا "نہ مٹّی کا ہے نہ لکڑی کا مجھے تو کسی قیمتی پتّھر کا معلوم ہوتا ہے۔ شاید عقیق کا ہے۔"
"عقیق کا؟" عشرت خانم ہرن کو دیکھنے کے لیے آدھی اُٹھ گئیں۔
"بڑے بڑے گھروں کے دیوان خانے دیکھے ہیں" ہُما نے جھوم کر کہا "ایسے ٹھاٹھ کہیں نظر نہیں آئے۔"
عشرت خانم ہاتھ مل کر بولیں "اتنے بڑے گھر کی لڑکی جانے مزاج کی کیسی ہو گی؟"
"میں نے تو کہا تھا پہلے دیکھ داکھ لیجیے" وقار نے کہا۔
"ہُما سے پُوچھو" عشرت خانم بولیں "مجھے تو یہی گھیٹے لیے پھر رہی ہے۔"

"تو کیا ہے اماں؟" ہُما بولی۔ "اس میں نقصان کونسا ہے۔ اتنا بہُت سا جہیز ملے گا"
"تم بھی تو اتنے بڑے گھر کی بہو بن کر گئی تھیں"۔ عشرت خانم اُداس ہو گئیں۔ "بتاؤ کیا ملا؟"
"چُپ"۔ ہُما نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔
تینوں یوں سنبھل بیٹھے جیسے اُن کی تصویر اُترنے والی ہے۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ آ رہی تھی۔ ساتھ ہی بغل والے کمرے میں ریشمی پردے کے ادھر چینی کے برتن بجنے لگے تھے۔
نُور النساء پردہ ہٹا کر بولیں۔ "آجا بیٹی! شرمانے کی کونسی بات ہے۔ اپنی خالہ ہیں۔ اپنی باجی ہما ہیں۔ جن سے تو سلیمہ کے ہاں ملی تھی۔ سب اپنے ہیں، آجا"
معصُومہ کی صُورت میں ریشم اور نائیلون کا ایک ڈھیر دیوان خانے میں داخل ہُوا۔ وقار ادب سے کھڑا ہو گیا۔ عشرت خانم اور ہما نے معصُومہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور نُور النساء نے معصُومہ کو وقار کے بالکل سامنے والے صوفے پر بٹھا دیا۔
معصُومہ نے ایک دو بار سر سے کھسکتے ہُوئے دوپٹے کو درست کرنے کے لیے اپنا ہاتھ یوں ہولے سے اُٹھایا جیسے ذرا تیزی سے اُٹھایا تو ریشم کہیں نہ کہیں سے ضرور مسک جائے گا۔ وہ عمر کے اس حصّے میں تھی جہاں بدصُورتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔
ہُما معصُومہ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی، مگر جی باجی نہیں سے زیادہ کسی سوال کا جواب نہ ملا۔ وقار معصُومہ کو یوں چوری چوری دیکھتا رہا جیسے اپنے مکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ نُور النساء معصُومہ کی سلیقہ مندیوں اور کشیدہ کاریوں کے قصّے سناتی رہیں، اور عشرت "ماشاء اللہ ماشاء اللہ" سے جواب دیتی رہیں۔
پھر جب لٹھے کی صاف سُتھری شلوار قمیص میں ملبوس ملازم نے بغل والے دروازے کا کمرہ کھول کر پردہ سرکایا اور سب لوگ طعام گاہ میں داخل ہُوئے، تو عشرت خانم تو جیسے گونگی ہو کر رہ گئیں۔ اِتنے بڑی میز پر بچھے ہُوئے منقش پلاسٹک پر ایسی کراکری نظر آئی جس کے بارے میں اُنھوں نے بازار میں گزرتے ہُوئے کئی بار کہا تھا کہ ایسے برتنوں کے لیے دو ہی جگہیں مناسب ہیں۔ دکانوں کے شوکیس یا وزیر، وزراء کی طعام گاہیں۔ مگر یہ تو حاجی مُقتداء احمد کا گھر تھا۔ منیاری کی دکان ہے اور خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ عشرت خانم نے سوچا یہ تو خاصے کھاتے کھلاتے پیتے چھلکاتے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ طعام گاہ کے بڑے پن کو صرف ایک ریفریجریٹر کی کمی نے ٹھیس پُہنچا رکھی تھی۔ یا معصُومہ کی انتہا درجے کی شرم و حیاء نے۔ معصُومہ نے

نہ تو بڑے گھروں کی لڑکیوں کی طرح چہک چہک کر چائے بنائی، نہ کوئی پلیٹ اُٹھا کر دُقار چھوڑ، ہُما اور عشرت خانم تک سے کہا کہ یہ خاص میرے ہاتھوں کی بنائی ہُوئی چیز ہے۔ نہ اس نے کسی ذراسی بات پر بڑا سا قہقہہ لگایا اور نہ اس انداز سے تعجب کا اظہار کیا کہ سب لوگوں کی نگاہیں اس پر گڑ جائیں، اور اُس کی بھنوؤں کے کٹیلے پن اور آنکھوں کے ہوشربا طول وعرض سے لے کر اس کی لمبی گردن کے مرمر تک کا جائزہ لے آئیں، وہ ہُما اور اپنی اماں کے درمیان بیٹھی دیر تک مسلسل ایک ہی بسکٹ کو ذرا ذرا سا چکھتی رہی اور پیالی میں سے ایک ایک قطرہ چائے پی کر پرچ میں اسے یوں کوئی آواز پیدا کیے بغیر رکھتی رہی، جیسے پیالی اور پرچ دونوں گتے سے بنی ہیں۔

" حاجی صاحب جب عدن میں بزنس کرتے تھے،" نُورالنساء نے بتایا۔" تو وہ دُنیا جہان کے عجائبات اپنے گھر میں بھرتے رہے۔ چھ قسم کے تو چائے کے صرف روسی سیٹ تھے۔ کافی کے تین سیٹ اُنھوں نے ولایت جانے والے ایک دوست کے ہاتھ جرمن کے ملک سے منگائے اور اُن کی قیمت جو ادا کی اس کا اندازہ آپ سے زیادہ کس کو ہوگا۔ ایران سے وہ جس آدمی کے ہاں سے قالین منگاتے تھے وہ اُن سے یوں خط کتابت کرتا تھا جیسے حاجی صاحب عدن میں قالینوں کے سوداگر ہیں۔ ایک بار انھیں کھانے کے کمرے کی میزیں خریدنے کا شوق چرایا تو ایک دو سال کے اندر ساگوان کی اکٹھی پانچ میزیں جمع کر لیں۔ میں چیخی چلائی تو بجائے اس کے کہ نیلام کر دیتے، اپنے انگریز دوستوں کو مفت میں دے آئے۔ نیلام کرتے تو چار پانچ ہزار روپے تو ضرور آجاتے۔ اب آپ سے زیادہ کس کو اندازہ ہوگا کہ اگر نیلام کے دام یہ ہیں تو اصل قیمت کیا ہوگی۔ پھر جب اتنے بڑے بنگلے میں ایک نیا تنکا تک رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر اپنے وطن کی آزادی کے بعد اُنھوں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تو ساری عمر کی کمائی وہیں اونے پونے بیچنا پڑی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں اور عرب شیخوں نے آکر بولیاں دیں۔ گھر سے باہر بازار لگ گیا۔ معصومہ اس وقت یہی کوئی چار پانچ سال کی ہوگی۔ اسے بھی یاد ہوگا، کہ اس روز کیسے سارا عدن ہمارے گھر سے باہر اُمڈ پڑا تھا، یاد ہے بیٹی؟"

" جی" معصومہ بولی۔

" اور بہن عشرت خانم" نُورالنساء نے کہنا شروع کیا:

" واپس وطن آکر"

باہر کا دروازہ کھُلا اور صاف ستھرے ملازم نے اندر آکر پوچھا:

"اور چائے لا دوں بی بی؟"

"لے آؤ" نورُالنساء فوراً بولیں۔

عشرت خانم اور ہُما چلّا اٹھیں۔

"نہیں نہیں، ابھی رکھی ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی اور ملازم بڑے اَدب سے وہیں کھڑا رہا۔ سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے لیے نورُالنساء نے گلا صاف کیا اور عشرت خانم کی طرف متوجہ ہوئیں، مگر فوراً سیدھی ہو بیٹھیں اور بولیں۔

"ضرورت ہُوئی تو بلالیں گے جاؤ۔"

ملازم چلا گیا تو نورُالنساء بولیں۔

"تو بہن میں کہہ رہی تھی کہ وطن واپس آکر حاجی صاحب نے کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا، تو اب تک ختم ہونے میں نہیں آیا۔ ادھر جس کمرے میں بھی جائیے کتابیں ہی کتابیں ٹھنسی پڑی ہیں۔ معصومہ اور میں کسی اور بات کی عادی تھیں یہ سب غریبانہ چیزیں جو آپ کو یہاں نظر آ رہی ہیں، وہ ہم دونوں ہی کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ ہیں۔ یہ چیزیں میں نے جمع کر دی ہیں۔ انھیں ترتیب سے لگانے کا سلیقہ معصومہ کا ہے۔"

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ" عشرت خانم بولیں۔

"سلیقہ ہی تو سب کچھ ہے" ہُما بولی۔ "ورنہ مشین تو آدمی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہے۔"

وقار اپنے مکان کی چھت پر کھڑا نظر آنے لگا۔

واپس دیوان خانے میں آکر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ معصومہ کھڑی رہی، اور اُسے کھڑا دیکھ کر وقار بھی ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ پھر نورُالنساء نے کہا۔

"ادھر آج میری بیٹی جمیلہ کے بچّے آئے ہُوئے ہیں۔ صبح سے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے معصومہ کو اجازت دیجیے کہ جا کر اُنھیں سنبھالے۔ چائے پینے میں کپڑے سان لیں گے چھوٹے چھوٹے سے ہیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں" عشرت خانم بولیں۔

"میں بس ایک منٹ میں حاضر ہُوئی" نورُالنساء نے کہا اور بیٹی کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ چند منٹ تک ماں، بیٹی اور بیٹا چپ چاپ بیٹھے رہے، جیسے مینار کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد چوٹی پر آئے ہیں تو چکرا گئے ہیں۔

"اماں جی!" ہما بولی، "دیکھا"
عشرت خانم ابھی جواب نہیں دے پائی تھیں کہ باہر سے ڈرائیور کی آواز آئی، بی بی جی!
"کیا بات ہے؟" عشرت خانم جلدی سے باہر نکلیں۔ ڈرائیور کی بات سُن کر بولیں۔
"بس کوئی پانچ منٹ میں، زیادہ نہیں"
ڈرائیور اپنی سیٹ پر واپس جا بیٹھا۔ عشرت خانم نے اُوپر جاتی ہُوئی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ذرا دیر کھڑی سوچتی رہیں۔ پھر دیوان خانے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر بولیں "تم دونوں یہیں بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں اُوپر سے ہو کر آتی ہوں۔ نُورالنساء کے نواسے نواسیوں کو ایک ایک روپیہ دے آؤں"
"ایک ایک روپیہ؟" ہما بولی، "نہیں اماں، دو دو دیجیے گا۔ کیوں وقار؟"
"اماں کی مرضی ہے" وقار بولا۔
"دو دو دے دوں گی، پر نہ جانے ہیں کتنے؟" عشرت خانم سوچنے لگیں۔ ہما نے بڑی ناگواری سے کہا۔
"اُفوہ اماں، کبھی کبھی تو آپ حد کر دیتی ہیں۔ جتنے بھی ہوں پر دے دیجیے گا دو دو"
عشرت خانم نے کچھ کہے بغیر پردہ گرا دیا اور آہستہ آہستہ اُوپر جانے لگیں۔ سیڑھیوں کے پہلے ہی موڑ پر رک گئیں کیونکہ اوپر سے نُورالنساء اُتر رہی تھیں۔ انھوں نے عشرت خانم کو یہاں کھڑے دیکھا تو پہلے ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر بولیں،
"اے بہن، دیوان خانے میں جا کر بیٹھیے، یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟"
"یوں ہی ذرا جی چاہا کہ اُوپر سے بھی ہو آؤں" عشرت خانم نے مسکرا کر کہا، "دو تین منزلوں والے مکان میں گھر کا ماحول اُوپر کے حصّے ہی میں ملتا ہے اور میں گھریلو عورت ہوں۔ آپ کے نواسے نواسیوں کو بھی تو نہیں دیکھا۔ چلیے، ملا دیجیے ان سے"
"میں انھیں نیچے ہی بلائے لیتی ہوں" نُورالنساء بضد رہیں۔
"ایک تو اُوپر بچّوں نے دُنیا جہان کا کوڑا کباڑ جمع کر رکھا ہے، دُوسرے"
"تو کیا ہُوا؟" عشرت خانم نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا، اور نُورالنساء کا بازو پکڑ کر کہا، "آئیے"
"نیچے ہما بیٹی اور وقار بیٹا کیا کہیں گے کہ" ...... نُورالنساء نے احتجاج کیا۔
"کچھ نہیں کہیں گے" عشرت خانم نے نُورالنساء کو کھینچا "میں اُن سے کہہ آئی ہُوں کہ میں اُوپر جا

رہی ہوں"

نورالنساء چپ چاپ عشرت خانم کے ساتھ ہولیں۔

آخری سیڑھی تک پہنچی تھیں کہ معصومہ کی کھنکتی ہوئی آواز گوش زد ہوئی۔

"اے کلثوم، اس زاہد کے بچے کو پکڑ، یہ چائے سے سنے ہوئے ہاتھ لیے میرے کپڑوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے تو اتنی دیر تک نیچے بیٹھ کر ان کی استری تک خراب نہیں ہونے دی، اور یہ انھیں گنجلنے چلا ہے۔ سلیمہ کیا کہے گی کہ......"

یکایک نورالنساء نے اونچی آواز میں باتیں کرنی شروع کر دیں۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا بہن کہ آپ کو کس کمرے میں لے جاؤں۔ آج تو یہاں سے وہاں تک بچوں کا گھر بنا ہوا ہے، یہ اُٹھا پٹخ مچائی ہے اُنھوں نے کہ اللہ میری توبہ ہے۔ پھر جس طرح اُنھوں نے یکایک بولنا شروع کیا تھا اسی طرح یکایک رُک گئیں اور چہرے پر ایسی کیفیت طاری کر لی جیسے کان لگا کر کچھ سن رہی ہوں۔

عشرت خانم نے اپنی میزبان کو ایک لمحہ غور سے دیکھا، پھر بولیں "ادھر بچوں کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہائے بہن وہاں تو....." نورالنساء جیسے رونے کے قریب پہنچ گئیں، مگر عشرت خانم کو بڑھتے دیکھا تو ان کے ساتھ ہولیں۔

"اے ہے بیٹی، کپڑے بدل لیے؟" عشرت خانم دروازے کے سامنے جا کر بولیں اور نورالنساء نے قدم روک لیے۔ جیسے اپنی بیٹی سے ان کا پردہ ہے۔

میلی داغی دیواروں اور جالوں بھری چھت والے اس کمرے کے دروازے پر پرانے دوپٹے کا ایک ادھا سا پردہ لٹک رہا تھا۔ جس کا ایک سرا اُٹھا کر کواڑ سے اٹکا دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی ادوائن کا ایک کھٹولا پڑا تھا۔ جس پر معصومہ کے ریشمی لباس کا ڈھیر رکھا تھا اور پائینتی کے پاس پانچ چھ برس کا ننگا زاہد کھڑا چائے سے سنی ہوئی انگلیاں چوس رہا تھا۔ اکھڑے ہوئے سیمنٹ کے فرش پر پانچ لڑکے لڑکیاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چائے ایک کالی بھجنگ پتیلی میں تھی۔ چائے پینے والوں میں سے کسی کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ تھا، تو کسی کے سامنے مراد آبادی کٹورا رکھا تھا۔ ایک بچے کے ہاتھ میں چینی کی پیالی تھی، جس کی دستی ٹوٹ چکی تھی ایک لڑکی نے ہاتھوں کو چائے کی تپش سے بچانے کے لیے ایلومونیم کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس کو اپنی فراک میں لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں یوں اُٹھا رکھا تھا کہ اس کا ننھا سا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی لڑکی کلثوم کے سامنے ایک

پلیٹ میں لال شکر رکھی تھی جسے مکھیوں نے سیاہ کر ڈالا تھا۔ وہ کرے ہوئے کناروں والی ایک پرچ میں چائے پی رہی تھی۔ معصومہ میلی چکٹ شلوار اور قمیص پر ایک چھلنی چھلنی دوپٹہ اوڑھے ننگے پاؤں یوں کھڑی تھی، جیسے اسے چھو لیا جائے تو گر پڑے گی۔ اس کی لمبی سیاہ آنکھوں میں خوف گھس گیا تھا اور اس کے گلابی ہونٹوں پر نیل پڑ رہے تھے۔

عشرت خانم دروازے میں کھڑی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ پھر مسکرا کر نورالنساء کی طرف دیکھا، تو وہ غائب تھیں۔

"اے بہن نورالنساء" وہ پکاریں۔ جواب نہ پاکر سنجیدہ ہوگئیں، اور اِدھر اُدھر دیکھ کر آگے بڑھ گئیں۔ ساتھ والے کمرے سے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے دروازے پر پہنچیں تو دیکھا کہ نورالنساء جلدی جلدی برتن سمیٹ رہی ہیں۔

"وہ بہن"، انھوں نے کہا اور نورالنساء سناٹے میں آگئیں۔ پھر بولیں۔ "یہ باورچی خانہ ہے۔ بچوں نے آج اسے کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ ہائے بہن، مجھے تو....."

پھر وہ خاموش ہوگئیں۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا، تو خاموش ہو جاتا۔ وجہ یہ تھی کہ عشرت خانم ہنس رہی تھیں۔

معصومہ پرلے دروازے میں سے ڈری جھانک رہی تھی، جیسے وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہے جس کی ایک ذرا ہی لمحوں کے اندر مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ٹکر ہونے والی ہے۔

عشرت خانم ہنسے جا رہی تھیں اور اب پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ "ہائے میرے اللہ" وہ بڑی مشکل سے بولیں۔ "توبہ ہے" انھوں نے بڑی محنت سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے دیکھا۔

نورالنساء کے ایک ہاتھ میں پتیلی اور دوسرے ہاتھ میں اپنا سر تھا اور وہ یوں بیٹھی تھیں جیسے کہ بیٹھی کی بیٹھی رہیں گی۔

عشرت خانم پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ "اے بہن، معاف کرنا" وہ بولیں۔ "آپ نے مجھے یہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور یہ پچکی ہوئی پتیلیاں پہلے کیوں نہیں دکھائیں؟ یہ کالی میلی دیواریں اور یہ پرانے دوپٹوں کے پردے آپ نے اوپر کیوں چھپا رکھے تھے؟ یہ ننگے اور ادھ ننگے بے دھلے، بے نہائے بچے، وہ ٹوٹا ہوا کھٹولا اور یہ بے کنڈے کا توا۔ اے بہن نورالنساء! آپ نے یہ سب کچھ مجھ

سے کیوں چھپایا؟ اور ذرا ادھر تو ہٹیے بہن!" عشرت خانم اُٹھ کھڑی ہوئیں " وہ کیا رکھا ہے؟ اچھا تو وہ تمام چینی کی چوٹ لگی پلیٹیں ہیں، جن کے کناروں پر چنے کی دال اب تک جمی ہوئی ہے۔ ادھر معصومہ بیٹی کے کمرے میں جو چارپائی رکھی ہے اس کی ادوائن کو پورا کرنے کے لیے اس میں کسی کا کمربند بھی تو باندھ دیا گیا ہے۔"

عشرت خانم نے یہاں رک کر دو تین قہقہے مارے۔ پھر آنکھیں پونچھنے کے لیے اپنے دوپٹے کا پلو پکڑا۔ مگر دوپٹے کو ابھی آنکھوں تک نہیں لے گئی تھیں کہ وہ نورُالنساء کو یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں جیسے گھنی دھند میں راستہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ "بہن" وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئیں۔

عشرت خانم باورچی خانے میں داخل ہو کر نورُالنساء کے پاس بیٹھ گئیں۔ نورُالنساء کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں سے بینائی جیسے چوس لی گئی تھی۔

" دیکھیے بہن۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔" عشرت خانم نے کہا۔ "نیچے سیڑھیوں میں الگ۔"

نورُالنساء گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں، تو اُن کی ریڑھ کی ہڈی میں سے چٹاخ پٹاخ کی دو تین آوازیں آئیں، جیسے تیز ہوا میں خشک ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہوں۔

عشرت خانم مُنہ میں دوپٹے کا ایک پلو ٹھونسے اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سیڑھیاں اتر گئیں۔ پھر رک کر اوپر دیکھا۔ نورُالنساء برسوں کے مریضوں کی طرح سیڑھیوں کے جنگلے کے سہارے آہستہ آہستہ اتر رہی تھیں۔ جب وہ عشرت خانم کے قریب آئیں تو آنکھیں جھکا کر اتری چلی گئیں۔ مگر عشرت خانم نے ان کا بازو پکڑ کر روک لیا۔ پھر اپنے مقابل کھڑا کر کے مُنہ سے دوپٹہ نکالا اور بجائے بولنے کے ہنسنے لگیں۔

" جوتیاں مار لیجیے بہن عشرت خانم۔" نورُالنساء کی کہیں دُور سے آواز آئی۔ "پر یہ جو آپ کی ہنسی ...."

نورُالنساء آگے کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ نیچے کسی نے دروازے پر دستک دے دی۔ نورُالنساء بھڑک کر تیزی کے ساتھ اتریں۔ مگر جب تک، وہ سیڑھیاں اتریں، ایک لڑکے نے دروازہ کھولتے ہی کڑک کر کہہ دیا۔

"بی بی جی سلام، آپا جی کہہ رہی ہیں کہ جب مہمان چلے جائیں تو ہمیں جلدی سے بتا دیجیے گا۔ کہتی ہیں، قالین اور صوفہ پردے بیشک کل تک رکھے رہیں۔ برتن اور سجاوٹ کی

چیزیں ہم آج ہی واپس منگائیں گے۔ صبح سویرے ہمارے ہاں مہمان آرہے ہیں۔"
نورالنساء آخری سیڑھی پر جنگلے کو مٹھی میں دبوچے کھڑی تھیں۔ اُنھوں نے صرف گردن کی جنبش سے، اچھا کہا، لڑکا دھڑسے دروازہ بند کر کے چلا گیا اور نُورالنساء آخری سیڑھی پر جیسے گر پڑیں۔

"ڈرائیور"، عشرت خانم زور سے پکاریں اور دیوان خانے کا پردہ ہٹا کر ہُما نے جھانکتے ہُوئے پُوچھا، "کیوں اماں جی، کیا ہے؟"

"میں نے ڈرائیور کو بلایا ہے، تم اندر بیٹھو" عشرت خانم بولیں۔ "اور دیکھو صوفے پر احتیاط سے بیٹھو۔ کپڑوں میں شکن نہ آئے۔ تمھاری سہیلی کیا کہے گی کہ مانگ کر پہننے کو لے گئیں اور گُنجل کر اور جھنجھٹ ڈال کر واپس کیے۔"

"اماں"، ہُما کے سینے پر عشرت خانم نے جیسے مکا مار دیا۔ پھر وہ تیورا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"بڑی بے لحاظ ہوتی ہیں اس زمانے کی لڑکیاں"، عشرت خانم نے نُورالنساء کے پاس آخری سیڑھی پر بیٹھتے ہُوئے کہا۔

"مانگے کے کپڑے یوں پہنتی ہیں جیسے باپ نے خرید کر دیے ہیں" پھر وہ ہنسنے لگیں اور ادھر پہلی بار نُورالنساء کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کا پرتو پڑا۔

"ڈرائیور۔ عشرت خانم نے اُٹھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور سامنے آیا تو وہ بولیں۔

"بھئی دیکھو۔ تم کار واپس لے جاؤ۔ ہم لوگ ٹانگے سے آجائیں گے۔ بیگم صاحبہ کو سینما دیکھنے جانا ہے تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کار کے مالک تو دوسروں سے کار مانگتے پھریں اور جو ایک گھنٹے کے لیے کار مانگ کر لائے ہیں وہ اس پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ کہنا بہُت بہُت شکریہ۔" پھر پانچ روپے کا ایک نوٹ بڑھا کر بولیں۔ "یہ لو تمھارا انعام ہے۔"

ڈرائیور سلام کر کے پلٹ گیا تو عشرت خانم دروازہ بند کر کے ہنسنے لگیں۔ پھر وہ اسی طرح ہنستی ہُوئی بڑھیں اور نورالنساء سے لپٹ کر بولیں۔ "اے بہن نُورالنساء خدا کے لیے ہنسیے، کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر کسی دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جا نکلے اور بہن۔ میری معصُومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔"

اب نُورالنساء کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

باہر کار سٹارٹ ہُوئی اور ڈرائیور نے رخصت کا ہارن دیا تو وقار جھپٹ کر دیوان خانے کے

دروازے پر آیا۔

"اماں جی، کار تو جا رہی ہے۔"

"جا رہی ہے تو جانے دو۔" عشرت خانم بولیں، "کیا یہ تمھارے باپ کی کار ہے۔"

وقار تیورا کر پیچھے ہٹ گیا اور نورالنساء پہلی بار قہقہہ مار کر عشرت خانم سے لپٹ گئیں۔ دونوں کی ہنسی وقار اور ہما کو ایک بار پھر دیوان خانے کے دروازے پر کھینچ لائی، جہاں وہ ریشمی پردہ ہٹا کر بلوں کی سی گول گول حیران حیران آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگے اور سیڑھیوں کے پہلے موڑ پر معصومہ کھڑی نیچے یوں دیکھ رہی تھی جیسے مداری نے ٹوکری کے نیچے جلا ہوا کاغذ رکھنے کے بعد اس سے کبوتر نکال لیا ہے اور عشرت خانم کہہ رہی تھیں "ہائے بہن نورالنساء میرے تو پیٹ میں بل پڑ گئے۔ قسم قرآن مجید کی پسینہ سرخی پاؤڈر بہالے جائے تو نیچے سے کیسے سچے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں۔ ہائے مجھے کتنا پیار آ رہا ہے آپ پر۔ آیئے! ذرا دیر کو اوپر باورچی خانے کے ننگے فرش پر جا بیٹھیں۔"

مشق

(۱)۔ عشرت خانم اور نورالنساء کے کردار میں کون سی خصوصیات مشترکہ ہیں؟

(۲)۔ افسانہ "گھر سے گھر تک" میں جس معاشرتی برائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

(۳)۔ بناوٹ اور تصنع کے مقابلے میں خلوص اور سادگی کا رشتہ زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ اس موضوع پر کم از کم دس جملے لکھیے۔

(۴)۔ دیوان خانے اور گھر کے عام کمرے میں کیا فرق تھا۔ تفصیلات لکھیے۔

(۵)۔ "پسینہ سرخی پاؤڈر بہالے جائے تو نیچے سے کیسے سچے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں۔" یہ جملہ کس نے اور کس موقع پر کہا؟

(۶)۔ اس افسانے کا خلاصہ لکھیے۔

(۷)۔ ان الفاظ و مرکبات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

ارتکاب، دھما چوکڑی، تنے ہوئے ہاتھ، کالی بھجنگ، گنجل، تیورا کر گرنا۔

لہُو اور قالین

میرزا ادیب

افراد

بابا ______________ نوکر
تجمّل ______________ ایک سرمایہ دار
اختر ______________ مصوّر
رؤف ______________ تجمّل کا پرائیویٹ سیکرٹری

منظر

تجمّل کی کوٹھی کا ایک وسیع کمرہ - اسے اختر سٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتا ہے - نہایت اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ، فرش پر قالین، دیواروں پر مشہور مصوّروں کے شاہکار - ایک طرف ریڈیو سیٹ کچھُ فاصلے پر صوفہ سیٹ اور کرسیاں - شمالی دیوار کے ساتھ لگی ہُوئی دونوں الماریوں میں کتابیں، کارنس اور تپائیوں کے اوپر تر و تازہ پھولوں سے مزیّن گلدان، دروازے اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے، وسط میں ایزل، ایزل پر کینوس جو ابھی تک سادہ اور صاف ہے - قریب ایک تپائی پر رنگوں کے ڈِبّے، چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں، طرح طرح کے مُوقلم اور مصوّری کا دُوسرا سامان -

گرمیوں کے ابتدائی زمانے کی ایک صُبح - روشندانوں میں سے دھوپ آ رہی ہے -

جب پردہ اٹھتا ہے تو بابا جھاڑن سے کمرے کی چیزیں صاف کرتا ہُوا دکھائی دیتا ہے - دو چار لمحوں کے بعد تجمّل آتا ہے - تجمّل کی عمر چالیس پنتالیس کے درمیان ہو گی - صحت نہایت اچھّی - جسم پر قیمتی سوٹ -

تجمّل : یہ اختر کہاں ہے ابا؟

بابا : ادھر باغ میں سرکار -

تجمّل : ابھی تک باغ میں! وہاں کیا کر رہے ہیں؟

بابا : ٹہل رہے ہیں - میں نے کہا بھی سرکار ناشتہ تیاّر ہے - اندر آ جائیں . مگر اُنھوں نے مجھے جھڑک دیا - ابھی دھوپ میں ٹہل رہے ہیں - رات سرکار......

(خاموش ہو جاتا ہے)

تجمّل: رات کیا؟

بابا: میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ ہُوا یہ سرکار کہ میری اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ باغ میں کوئی شخص گھوم رہا ہے۔ سمجھا چور ہے۔ شور مچانے ہی والا ہی تھا کہ اختر میاں کے ہاتھ میں ان کی چھڑی نظر آگئی۔

تجمّل: اس قسم کے لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں۔ الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔

بابا: سرکار! میں تو نہ خود یہاں آتا ہوں اور نہ کسی اور کو یہاں آنے دیتا ہوں۔ ذرا صفائی کے لیے یہاں پانچ دس منٹ کے لیے آجاتا ہوں۔ میں نے کہا سرکار!

تجمّل: کیا ہے؟

بابا: شاید کچھ پریشان ہیں چند روز سے۔

تجمّل: پھر وہی بات۔ ایک بار کہہ جو دیا۔ تم فنکاروں کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ہر وقت یونہی پریشان رہتے ہیں۔

بابا: (کچھ نہ سمجھتے ہُوئے) اچھا سرکار!

تجمّل: بلاؤ اُنھیں۔ جلدی کرو۔

(بابا کمرے سے نکل جاتا ہے۔ تجمّل آگے بڑھ کر کینوس کو دیکھنے لگتا ہے۔ اختر آتا ہے۔ ادھیڑ عمر کا شخص۔ بال بکھرے ہُوئے۔ آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے سُرخ۔ لباس پاجامہ اور قمیص۔ آستینیں چڑھی ہوئیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے زیادہ نمایاں)

اختر: (تجمّل کی طرف دیکھے بغیر) کہیے۔

تجمّل: بڑی دیر تک ٹہلتے رہے ہو آج۔

اختر: جی ہاں۔

تجمّل: ایک بہُت بڑی خوشخبری سنانے آیا ہُوں تمھیں۔ ابھی ابھی میرے ایک دوست نے فون کیا ہے: ججوں نے تمھاری تصویر کو اوّل انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ میں نے تفصیل معلوم کرنے کے لیے رؤف کو بھیج دیا ہے۔ ابھی آجائے گا۔

اختر: مجھے اخبار سے معلوم ہو چکا ہے۔

تجمل : (اختر کی بے نیازی پر متعجب) تمہیں اس کا علم تھا۔
اختر : اخبار صُبح سویرے مل جاتا ہے۔
تجمل : تمہیں یہ خبر سُن کر اتنی خوُشی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔میرے خیال میں یہ تمھارا بُہت بڑا کارنامہ ہے۔

(اختر خاموش ہے)

تم نے ملک کے تمام مصوّروں کے مقابلے میں یہ انعام جیتا ہے۔ یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں۔میں نے اس خوُشی پر آج شام چائے کا اہتمام کیا ہے۔تمھیں مبارک باد دینے شہر کے معززین آ رہے ہیں۔سُنا تم نے!

(اختر خاموش ہے)

کیا کہا؟
اختر : کچھُ نہیں۔
تجمل : کچھُ نہیں؟ (اختر کے چہرے کو غور سے دیکھ کر) شاید بابا نے غلط نہیں کہا تھا معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟
اختر : جی نہیں۔
تجمل : اس نے کہا تھا (مسکرا کر) ہمارے مصوّر کے ساتھ کچھُ گڑبڑ ہے ان دنوں۔تمھارا کیا خیال ہے اپنا؟
اختر : صحیح کہا تھا اس نے۔
تجمل : یعنی کہ.........
اختر : یہی کہ یہاں سے رُخصت ہونا چاہتا ہوں۔
تجمل : کیا کہا؟ (لہجے میں حیرت) رُخصت ہونے کی ضرُورت!
اختر : میرا دل چاہتا ہے۔
تجمل : کوئی شکایت؟ کوئی تکلیف؟
اختر : کوئی شکایت نہیں۔
تجمل : پھر بات کیا ہے؟ اگر کوئی تکلیف ہے تو صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے۔تمھارے لیے کیا کچھُ نہیں کیا جائے گا۔

اختر: میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں پھر بھی........
تجمل: پھر بھی کا کیا مطلب؟
اختر: مجھے جانا ہی چاہیے۔
تجمل: بے وقوف نہ بنو اختر! یہ بیٹھے بیٹھے آج تمھیں کیا ہو گیا ہے۔
اختر: اس کا جواب دے چکا ہوں۔
تجمل: اگر تمھیں کچھ نہیں ہُوا تو اس بے وقوفی کی وجہ؟ ذرا سوچو تو یہاں آکر تم نے کتنے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ کتنی زبردست قدر و منزلت حاصل کی ہے۔ اس سے بڑی عزت کیا ہو گی کہ آج تم مُلک کے بہترین مصوّر سمجھے جاتے ہو اور کیا چاہیے تمھیں؟
اختر: مجھے کچھ نہیں چاہیے رُخصت ہونے کی اجازت دیجیے۔
تجمل: میں اس پاگل پن کی اجازت نہیں دے سکتا۔
اختر: آخر کیوں؟
تجمل: اس پاگل پن کی اجازت کیوں کر دے سکتا ہوں؟
(اختر خاموش رہتا ہے)
تجمل: سنا ہے آرٹسٹوں پر کبھی کبھی دورے پڑتے ہیں شاید...... (اختر کی طرف مُسکرا کر دیکھتا ہے، اختر کا چہرہ بدستور سنجیدہ ہے) کچھ اسی قسم کی بات معلوم ہوتی ہے۔
اختر: مجھے مجبور نہ کیجیے۔
تجمل: کیا حماقت ہے۔ ایک شخص کو دلدل سے نکالا جاتا ہے اور جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اسی دلدل میں چھلانگ لگانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔
اختر: میرے فن کی بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں۔
تجمل: فن کی بات کرتے ہو؟ یہاں آنے سے پہلے بھی تمھارے پاس فن تھا اور — آج بھی ہے۔ مگر دونوں میں کتنا فرق ہے؟ تم خود نہیں جانتے یہ فرق۔
اختر: کیا آپ سمجھتے ہیں میں آپ کا شکر گزار نہیں ہوں؟
تجمل: اختر!
اختر: فرمائیے۔
تجمل: اگر تم سنجیدگی سے یہ بات کر رہے ہو تو سُن لو۔ میں تمھیں جانے کی اجازت نہیں دے

سکتا۔ یہ میری توہین ہے، لوگ کیا کہیں گے؟

اختر: لوگوں کو آپ کے اور میرے ذاتی معاملے سے کیا واسطہ؟

تجمل: تم دُنیا سے الگ تھلگ رہ کر مصوری کرتے رہتے ہو، تمھیں معلوم نہیں لوگ اس قسم کے واقعے پر کیا کہا کرتے ہیں۔ سب کہیں گے ایک غریب اور قلاش مصوّر کو جھونپڑی میں سے نکال کر دکھاوے کے لیے لایا اور پھر اسے واپس بھیج دیا۔ کیا یہ میری توہین نہیں ہے؟

اختر: (بھونچکا ہوکر) توہین — توہین کیسی؟

تجمل: اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اختر: صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ نے مجھے خرید لیا ہے اور اب میں آپ کے رحم وکرم پر ہوں۔

تجمل: یہ بات نہیں ہے اختر! (ملائمت سے) غور تو کرو۔ کتنی عجیب حالت ہوگی میری۔ میں نے فرداً فرداً کئی دوستوں کو چائے کی دعوت دی ہے۔ وہ ضرور شام کو آئیں گے۔

اختر: میرے جانے یا نہ جانے سے اس دعوت پہ کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

تجمل: میں سمجھتا ہوں نا فرق پڑتا ہے۔ اب اس پاگل پن کو چھوڑو اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔

اختر: آپ مجھے اس طرح نہیں روک سکتے۔

تجمل: روک نہیں سکتے۔ خُوب! جس شخص کو میں اپنا سمجھ رہا ہُوں اور اس پر مجھے اتنا حق بھی نہیں ہے کہ اسے کسی پاگل پن سے روک سکوں۔ آج تم اتنی بلندیوں پر پُہنچ گئے ہو اِس لیے جانا چاہتے ہو۔ تمھیں اس بات کا احساس نہیں کہ تمھیں ان بلندیوں تک پہنچانے میں میں نے بھی کچھُ حصّہ لیا ہے۔

اختر: آپ اصرار کرتے ہیں تو سنیے۔ جس اختر کو آپ ایک تنگ وتاریک کوٹھڑی سے نکال کر اپنے محل میں لائے تھے وہ مصوّر اختر مرچکا ہے اور جو شخص آپ کے سامنے کھڑا ہے اور جس کے لیے یہ شاندار سٹوڈیو بنایا گیا ہے وہ اس کی چلتی پھرتی لاش ہے۔

تجمل: معلوم ہوتا ہے دورہ بہت شدید ہے۔ مجھے ڈاکٹر کو فون کرنا چاہیے۔

(تجمل جانے لگتا ہے۔ اختر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے)

اختر: (لہجے میں کسی قدر تحکم) ٹھہریئے اور سب کچھُ سُن کر جایئے۔ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بیان کر دی ہے۔

تجمّل : یہ سب سے بڑی حقیقت ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ ڈاکٹر کو کرنا چاہیے۔

اختر : آپ ابھی تک اسے ایک مذاق سمجھ رہے ہیں حالانکہ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ ابھی تک آپ تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھ رہے ہیں اور اب اس بات کا دُوسرا رُخ دیکھیے جو اتنا خوفناک ہے کہ آپ کے تصوّرات کا شیش محل ابھی زمین بوس ہو جائے گا۔ گزشتہ ڈیڑھ برس میں جتنی تصویریں میرے نام کے ساتھ اس شاندار محل سے باہر گئی ہیں ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔

تجمّل : (اختر کو گھورتے ہُوئے) معاملہ اتنی دُور جا پہنچے گا مجھے اس کا وہم گمان بھی نہیں تھا۔ اختر! میرا مشورہ یہ ہے کہ اس وقت تمھیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔

اختر : ذرا تحمل سے کام لیجیے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے کہنے دیجیے۔

تجمّل : تم پاگلوں کی سی باتیں کر رہے ہو، تحمل سے کام خاک لوں؟

اختر : جب آپ کو پوری حقیقت معلوم ہو جائے گی، اس وقت فیصلہ کیجیے کہ یہ پاگل پن ہے یا کچھ اور۔

تجمّل : یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ آخر گزشتہ دو سال سے تم میرے مہمان ہو۔ اس دوران میں تم نے کئی تصویریں بنائی ہیں جو شہر کے معزز لوگوں کی کوٹھیوں میں آویزاں ہیں۔ ان میں سے اکثر میں نے تحفتہً اپنے دوستوں کو دی ہیں۔ یہ سب کی سب تمھاری ہیں۔ تمھاری اپنی تخلیق ہیں لیکن آج تم کہہ رہے ہو ان میں سے کوئی بھی میری نہیں ہے۔ کوئی اور سنے گا تو کیا کہے گا۔

اختر : مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی اور سنے گا تو کیا کہے گا۔ میرے لیے یہ کشمکش ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ اس خلش نے مجھے بے قرار کر دیا ہے۔ یہ فریب اب زندہ نہیں رہ سکتا۔

تجمّل : فریب؟ آج تمھیں کیا ہو گیا ہے اختر؟ کاش میں کچھ سمجھ سکتا کہ تمھاری پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ ڈاکٹر کو تم بلانے نہیں دیتے۔ میں کیا سمجھوں آخر؟

اختر : آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔ یہ کوئی معمّا نہیں ہے۔ سنیے! جیسا کہ آپ جانتے ہیں، آج سے دو سال پہلے میں ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر خستہ اور بدنما مکان میں رہتا تھا۔ بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے اور جو جانتے تھے اُنھیں میرے متعلق صرف یہی معلوم تھا کہ میں ایک مفلس، قلّاش اور گمنام مصوّر ہُوں۔ میں نے بے شمار تصویریں بنائی تھیں مگر وہ تمام کی تمام کباڑیوں یا نیلام گھروں میں پہنچ کر کوڑیوں کے بھاؤ بک چکی تھیں۔

زندگی اسی حالت میں گزر رہی تھی کہ اتفاقاً تصویروں کی ایک نمائش گاہ میں میری آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے میری تصویروں میں دلچسپی لی اور مجھے اسی شام کو اپنے ہاں چائے پر بلا لیا۔ میں اپنے ہزاروں ہم پیشہ بھائیوں کی طرح غربت کی چکی میں پس رہا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہ سکتی۔ آپ نے میری حالت کا اندازہ لگا لیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ میں اپنے غربت کدے سے نکل کر آپ کے ہاں آجاؤں تاکہ اطمینان کے ساتھ فن کی خدمت کر سکوں۔ آپ نے میرے لیے یہ کمرا وقف کر دیا اور مجھے زندگی کی ضروریات سے بے نیاز کر دیا۔

تجمل: ان باتوں کے ذکر کی کیا ضرورت ہے؟

اختر: میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے سلوک نے مجھ پر کتنا اثر ڈالا ہے۔ میں سمجھنے لگا کہ آپ نہایت اُونچے درجے کے انسان ہیں۔ دولت مند ہونے کے باوجود آپ کے پہلو میں ایسا دل دھڑک رہا ہے جو انسانیت نواز ہے۔ جس میں ساری دُنیا کا درد سمایا ہُوا ہے۔ آپ نے اپنے دوستوں کو بلا کر انھیں میری تصویریں دکھائیں۔ آپ نے بڑے بڑے اداروں کے دفتروں میں میری تصویریں آویزاں کرائیں۔ آپ نے میری شہرت کے لیے میری تخلیقات رسائل و جرائد میں چھپوائیں۔ سچ مچ اس وقت آپ میری نظروں میں ایک دیوتا تھے، ایک فرشتہ تھے، ایک ایسی ہستی تھے جس کی تعریف ہمارے قصوں اور کہانیوں میں کی گئی ہے۔

تجمل: میں نہیں سمجھ سکتا اس ذکر سے تمھارا مقصد کیا ہے؟

اختر: مگر تھوڑے عرصے بعد ہی ایک بھیانک خیال اپنا منحوس سایہ میرے ذہن پر ڈالنے لگا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نے آپ کی ذات کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے وہ محض میری اپنی خوش فہمی ہے حقیقت کچھ اور ہے۔

تجمل: کیا مطلب؟

اختر: مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آپ کی سرپرستی تو ایک اشتہار ہے آپ کی مصوّر نواز شخصیت کا۔ اس سرپرستی میں آپ کا ایک خاص مقصد چھپا ہُوا ہے۔

تجمل: کیا کہہ رہے ہو تم؟

اختر: آپ مجھے نواز رہے تھے مگر ایک خاص مقصد کی خاطر، اور وہ مقصد یہ تھا کہ آپ سوسائٹی کو بتانا چاہتے تھے، دیکھو میں کتنا اچھا ہوں۔ میں نے ایک غریب اور مُفلس مصوّر کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ میں نے اس کی صلاحیتوں کو زندہ رکھا ہے ورنہ یہ کب کی ختم ہو چکی

ہوتیں ـــ جس طرح بڑی بڑی دکانوں کے دروازوں پر انسانی پیکروں کو نہایت خوبصورت اور شفاف لباس پہنا کر انھیں الماریوں کے اندر سجا دیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان حسین وجمیل مجسموں کو دیکھ کر دکانداروں کے اعلیٰ ذوق اور اُن کی شان وشوکت سے مرعوب ہو جائیں ، اسی طرح آپ بھی اپنی امارت اور اپنی شخصیت کی نمائش کے لیے میری ذات کو اور میرے فن کو استعمال کر رہے ہیں۔

تجمّل : (غصے سے) یہ جھوٹ ہے سراسر جھوٹ ہے۔

اختر : اور آپ کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ مگر بلند آواز سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ آپ کے یہاں میری یہی حیثیت تھی اور جس وقت مجھے اس کا احساس ہوا مجھے محسوس ہوا جیسے میری اہلیتوں پر برف کی تہہ جم گئی ہے۔ میرے سینے میں ایک بھی شرارہ باقی نہ رہا۔ یہ احساس میرے لیے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا کہ اپنے جگر کا خون دے دے کر میں نے فن کی جس شمع کو اب تک روشن رکھا ہے، اس کا مقصد آپ کی شاندار کوٹھی اور آپ کی شخصیت کو جگمگانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ ایک فنکار یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا فن اپنا اصل جوہر کھو کر کسی کے لیے محض ایک ذریعہ شہرت بن کر رہ جائے۔ انھی دنوں مجھے ایک ہم پیشہ دوست مل گیا جو بدستور غربت کی چکی میں پس رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی ذہنی کیفیت بتائی اور التجا کی کہ وہ مجھے اپنے ہاں رہنے کی جگہ دے دے۔ یہ سن کر اس نے کہا : دیکھو اگر تم آج کل تصویریں نہیں بنا سکتے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ تمھارے لیے میں تصویریں بناتا رہوں گا۔ تم مجھے اتنے پیسے دے دیا کرو کہ میں اور میرا خاندان عزت و آبرو سے زندہ رہ سکیں۔ یہ تجویز میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ مگر اس کا اصرار کم نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح وہ کھیل شروع ہو گیا جو دُنیا کا سب سے گندہ اور ذلیل کھیل ہے۔ مجھے یہاں روپے حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ یہ روپے میں اسے دے دیتا تھا اور وہ مجھے اپنی تصویریں ـــ ان تصویروں کو میں۔

تجمّل : ان تصویروں کو تم۔

اختر : اپنی تخلیق بنا کر پیش کر دیتا تھا۔

(تجمل اس انداز سے اختر کو دیکھتا تھا جیسے ان الفاظ سے اسے دھچکا سا لگا ہو۔)

تجمّل : تم مجھے دھوکہ دیتے رہے اب تک !

اختر : دھوکہ یا کچھ اور ـــ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ نیازی کو وقتاً فوقتاً سکے ملتے رہے، مجھے بنی بنائی

تصویریں، اور آپ کو فن کی قدر افزائی اور مصوّر نوازی کے لیے سوسائٹی میں عزّت و احترام۔
تجمّل : میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی پست سطح پر اتر چکے ہو۔
اختر : میں نے خود کبھی نہیں سوچا تھا لیکن اس پست سطح پر اترنے کے لیے مجبور تھا۔ نیازی نے مجھے کئی تصویریں دی ہیں۔ یہ تصویریں آج آپ جیسے معزّز لوگوں کے ڈرائینگ روموں کی زینت ہیں۔ وہ پہلے کی طرح مفلس نہیں ہے۔ وہ اپنی بہن کی شادی کر چکا ہے۔ اسے روٹی اور کپڑے کی بھی تکلیف نہیں۔ اب مالک مکان بھی اسے پریشان نہیں کرتا۔ مگر میں جانتا ہوں اس کے دل کی کیا کیفیت ہے۔ اپنی اولاد کو چند سکوں کے عوض دوسروں کو سونپ دینا ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ ہے جس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ آج جب اس نے سنا ہوگا کہ اس کی بنائی ہُوئی تصویر اوّل انعام کی مستحق قرار پائی ہے تو اس کی کیا حالت ہُوئی ہوگی۔ وہ کیا سوچے گا۔ اُسے کتنا دکھ ہوگا۔ میں اس تصور ہی سے کانپ جاتا ہُوں۔
تجمّل : تو اب تک تم نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ اپنی نالائقی کو چھپاتے رہے۔ میں نے اتنی آسائشیں بے کار مہیا کی تھیں۔
اختر : آپ ان کی قیمت وصول کر چکے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس سودے میں آپ ہی کو فائدہ ہُوا ہے۔
تجمّل : اس قدر فریب دینے کے بعد اپنے محسن کو جلی کٹی سناتے ہُوئے تمھیں شرم نہیں آتی۔
اختر : مجھے شرم کیوں آئے گی۔ شرم تو آپ لوگوں کو آنی چاہیے جو بلندیوں پر پُہنچنے کے لیے ہزاروں انسانوں کو اپنی سیڑھی بنا لیتے ہیں۔ جو ایک فن کار کی سرپرستی کرتے ہیں تو اپنے مطلب کے لیے۔
تجمّل : اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھو کہ تم کیا ہو۔ احسان فراموش، چور، مجرم۔
اختر : میں سب کچھ ہوں، مگر تم۔ تم کیا ہو؟ یہ بھی تو کہو۔
تجمّل : میں؟
اختر : تجمّل تم — بتاؤ؟ خاموش کیوں ہو۔ بتاتے کیوں نہیں۔ دوسروں کے جرم دیکھ لیتے ہو۔ دوسروں کو مجرم کہتے ہو مگر اپنے متعلق نہیں کہتے۔ بتاؤ کون ہو تم؟

(رؤف آتا ہے۔ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں)

رؤف : وہ خبر بالکل درست ہے جناب! پہلا انعام اختر صاحب ہی کو ملا ہے۔ یہ رہا چیک (جیب سے چیک نکالتا ہے) آپ . . . . (دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔)
تجمّل : تم جاؤ اس وقت۔

رؤف: بہت بہتر جناب۔

(رؤف دروازے کی طرف جانے لگتا ہے، پھر ٹھہر جاتا ہے۔)

رؤف: اوہ یاد آگیا مسٹر اختر آپ کا کوئی واقف راستے میں ملا تھا۔ اس نے ایک پیغام دیا ہے آپ کے نام۔ آپ کا کوئی مصوّر دوست تھا نانیازی!

اختر: ہاں کیا ہُوا اسے؟ جلدی بتاؤ۔

رؤف: افسوس آج صُبح اس نے خودکشی کرلی۔

اختر: خودکشی؟

رؤف: جی ہاں۔ ہسپتال جانے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اختر: (تجمل سے) سنا تم نے۔ ابھی پُوچھ رہے تھے، میں کیا ہوں۔ اب تو تمھیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم کیا ہو۔ تم قاتل ہو۔ تم نے قتل کیا ہے۔

تجمّل: (غصّہ سے گرج کر) بکواس بند کرو۔

اختر: قانون تمھیں کچھُ نہیں کہے گا، مگر انسانیت کی نظروں میں تم قاتل ہو۔ تم نے دو قتل کیے ہیں۔ ایک مصوّر کے فن کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور دوسرے مصوّر کی جان لے لی ہے۔ یہ قتل نہیں تو اور کیا ہے؟ اور قتل کیا ہوتا ہے؟

تجمّل: نکل جاؤ یہاں سے کمینے پاجی احسان فراموش۔

اختر: میری زبان رک نہیں سکتی۔ میں چیخ چیخ کر کہوں گا۔ دیکھو لوگو! یہ قاتل ہے۔ اس کے ہاتھ خون میں رنگے ہُوئے ہیں۔ یہ سوسائٹی کا خوفناک مجرم ہے۔ یہ ——

تجمّل: رؤف! کھڑے کیوں ہو اس پاجی کو دھکے دے کر نکال دو۔ لے جاؤ اسے پاگل خانے میں، پولیس کو ٹیلیفون کر دو یہ پاگل ہو گیا ہے۔ خطرناک پاگل ہے۔

(رؤف، اختر کو دھکے دے کر باہر نکالنے لگتا ہے۔ اختر چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے "تم قاتل ہو۔ تم نے قتل کیا ہے —— میں خاموش نہیں رہوں گا ——" یہ آواز آہستہ آہستہ ڈوبنے لگتی ہے۔ تجمّل دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہے —— پردہ گرتا ہے)

مشق

۱ - ڈرامہ لہو اور قالین کا مرکزی خیال کیا ہے؟
۲ - اختر کے کردار میں آپ کو کون سی باتیں نظر آتی ہیں جو معاشرے میں عام ہیں؟
۳ - اختر نے تجمل کو قاتل کیوں کہا؟
۴ - مصوّر نیازی کی موت کا اصل ذمے دار کون ہے؟
۵ - اس ڈرامے میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں انھیں کہانی کے انداز میں لکھیے۔
۶ - درج ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے:

(ا) "اپنی اولاد کو چند سکوں کے عوض دوسروں کو سونپ دینا ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ ہے جس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے"۔

(ب) "تم قاتل ہو تم نے دو قتل کیے ہیں۔ ایک مصوّر کے فن کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور دوسرے مصوّر کی جان لے لی ہے"۔

۷ - ان الفاظ و مرکبات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔
مستحق، قدر و منزلت، تلاش، تصوّرات کا شیش محل، غربت کدہ، تخلیقات، احسان فراموش۔

۸ - جملے درست کیجیے۔

(ا) میرا زبان سچ بولتا ہے۔
(ب) اس نے ایک مصوّر کے فن کو موت کی گھاٹ اتارا ہے۔
(ج) اس نے دو قتل کیا ہے۔
(د) میں احسان فراموش نہیں ہے۔
(ہ) میں جانتا ہے کہ تمھاری توجہ کی وجہ سے مجھ کو ترقی کے موقع ملا ہے۔
(و) مجھے پڑھنے میں کوئی دقت نہیں پیش آتا۔

بے سبب

انتظار حسین

بیوی نے اس کی طرف غور سے دیکھا "کس بات پہ ہنس رہے ہو"
"میں ہنس رہا ہوں؟ نہیں تو" وہ سٹپٹا گیا۔
"تو ہنس ہی نہیں رہے ہو۔ باچھیں تو کھلی جا رہی ہیں" رکی۔ پھر بولی "کوئی یاد آ رہا ہے"
"یاد کون آتا" وہ سٹپٹا کر چپ ہو گیا۔

کئی مرتبہ اس نے کوشش کی کہ بیوی اِدھر اُدھر ہو جائے تو دل کھول کر ہنسا جائے۔ مگر وہ ٹس سے مس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ناشتے کے برتن باورچی خانے میں رکھے اور فوراً ہی واپس آ گئی۔ رفتہ رفتہ اسے یقین آ گیا کہ گھر میں اسے ہنسنے کی آزادی میسر نہیں آ سکتی۔ پھر کہاں جایا جائے۔ گھر کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے باہر تصور دوڑایا اور ایسے مقامات کو دھیان میں لایا جہاں اطمینان سے ہنسنے کے امکانات تھے۔ اصل میں آج صبح ہی سے اس کا ہنسنے کو جی چاہ رہا تھا۔ دفتر آج اسے دیر سے جانا تھا۔ خیال یہی تھا کہ گھر میں اطمینان سے بیٹھیں گے اور ہنسیں گے۔ جب گھر کے اندر ہنسنے کے امکانات اس نے مسدود دیکھے تو اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"تمھیں تو دفتر آج دیر سے جانا تھا" بیوی نے ٹوکا۔
"ہاں مگر ایک دو کام باہر کے ہیں۔ سوچا کہ انھیں نبٹا لیا جائے۔ پھر اُدھر سے اُدھر ہی دفتر چلا جاؤں گا"
"جا رہے ہو تو بجلی کا بل بھی ادا کر دو پرسوں آخری تاریخ ہے" یہ کہتے کہتے بیوی اٹھی۔ اندر گئی اور واپس آ کر بجلی کا بل اور رقم اس کے حوالے کر دی۔

جب وہ چلنے لگا تو بیوی کو پھر ایک کام یاد آ گیا "اجی میں نے کہا کہ خالہ اماں کو منی آرڈر بھی تو بھیجنا تھا بل ادا کر دو تو وہیں کہیں ڈاکخانہ میں منی آرڈر بھی کر دینا" اور جلدی سے سو کا نوٹ اندر سے لا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

گھر سے نکل کر اس نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ اب میں اطمینان سے ہنس سکتا ہوں۔ سکوٹر سٹارٹ کرتے ہوئے ہنسی اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی تھی کہ دفعتاً خیال آیا کہ لوگ اسے سکوٹر پہ ہنستا دیکھیں

گے تو کیا کہیں گے۔ آدمی سکوٹر پر بیٹھا ہو اور ہنس رہا ہو تو کتنا عجب سا لگتا ہے۔ بس اس خیال کے ساتھ اس نے ہنسی کو ملتوی کر دیا۔

بجلی کے بل کی ادائیگی کے لیے بنک پہنچا تو کاؤنٹر کے سامنے ایک پوری قطار کو پایا۔ وہ بھی قطار میں لگ گیا۔ قطار میں کھڑا رہا۔ بور ہوتا رہا۔ جیسے تیسے باری آئی۔

بل ادا کر کے ڈاکخانے پہنچا منی آرڈر فارم لے کر اُسے پُر کیا۔ فارم پُر کرتے کرتے کاؤنٹر پہ اور کئی منی آرڈر بھیجنے والے آکھڑے ہوئے۔ ایک کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ وہ سب سے پیچھے تھا۔ سب سے بعد میں اس کی باری آئی۔

بنک اور ڈاک خانے نے اسے بہُت بور کر دیا تھا۔ سوچا کسی ٹھنڈے گوشے میں بیٹھ کر چائے پی جائے کہ طبیعت بحال ہو۔ قریب ہی ریستوراں تھا۔ اس میں داخل ہو گیا۔ ٹھنڈا پانی پیا گرم چائے کا گھونٹ چڑھایا تب کہیں جا کر طبیعت بحال ہوُئی طبیعت کی بحالی کے ساتھ ہنسنے کی خواہش عود کر آئی۔ مگر فوراً ہی خیال آیا کہ آس پاس کی میز سے کسی نے اسے ہنستے دیکھا تو کیا سوچے گا یہی کہ اس آدمی کا دماغ چل گیا ہے۔ اس نے اردگرد نظر ڈالی۔ میزیں بھری ہوُئی تھیں۔ یہ لنچ کا وقت تھا۔ سب کھانے میں مصروف تھے کسی چہرے پر کوئی ہنسی نہیں تھی۔ مجھے ہنسنے کی فرصت ہے، اس نے سوچا۔ مگر میں اکیلا ہوں۔

آدمی اکیلا ہو اور ہنس رہا ہو تو خواہ مخواہ شک ہوتا ہے کہ سنک گیا ہے تو ہنسنے کے لیے دوسرے کی شرکت ضروری ہے۔ یہ عجب طرح کی پابندی ہے، اس نے چڑ کر سوچا۔

سوچا دفتر چلنا چاہیے۔ ہنسنے کے لیے دفتر سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ وہاں ہنسنے میں شرکت کرنے والے آسانی سے میسّر آجاتے ہیں۔ دفتروں میں ان دنوں یہی کچھ ہوتا ہے۔ فائلوں کے ڈھیر لگتے رہتے ہیں۔ دفتری وقت باتوں میں گزرتا ہے کبھی سیاسی مسائل پر بحث کبھی لطیفہ بازی۔ فاروقی کو کتنے لطیفے یاد ہیں۔ اسے بس بہانہ چاہیے، شروع ہو جائے گا۔ مگر دفتر میں پہنچ کر اس نے اور ہی فضا دیکھی مسئلہ یہ زیرِ بحث تھا کہ فاروقی کی سینیارٹی کو نظر انداز کر کے علی احمد کو جو فاروقی سے جونیئر تھا، اگلا گریڈ دے دیا گیا تھا۔ فاروقی کا موڈ سخت آف تھا۔

ایک بیزاری کے ساتھ وہ دفتر سے گھر کی طرف چلا۔ بس اسی بیزاری کے عالم میں اس کے ذہن میں ایک سوال اُٹھ کھڑا ہوا کہ آخر وہ ہنسنا کیوں چاہتا ہے۔ ہاں آخر میں ہنسنا کیوں چاہتا ہوں لیکن کیا ہنسنے کے لیے کسی سبب کا ہونا ضروری ہے! اسے یاد آیا کہ صبح جب اس کی بیوی نے اس سے پوچھا تھا کہ کیوں ہنس رہے ہو۔ اسے اس سوال سے کتنی گھبراہٹ ہوُئی تھی۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں ہر فعل پر یہ سوال کھڑا کر تاکہ

کیوں کر رہے ہو کتنی فضول بات ہے۔ آدمی کو کچھ کام ایسے بھی تو کرنے چاہییں جن کا کوئی مقصد نہ ہو۔ تو مجھے اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ میں کیوں ہنسنا چاہتا ہوں۔ بس ہنسنا چاہتا ہوں محض اور صرف ہنسنا کسی وجہ کے بغیر، سبب اور مقصد کے بغیر۔

اُس نے اپنے اس استدلال سے اپنے آپ کو قائل کر لیا تھا۔ مگر دل کے اندر ایک چور تھا۔ دوسروں کو وہ کیسے قائل کرے گا۔ دوسرے ہنسنے اور رونے دونوں کی وجہ پوچھتے ہیں تو دوسروں کو وہ کس طرح قائل کرے گا۔ دوسروں کو قائل کرنے کی تدبیر سوچتے سوچتے اس نے اِرد گرد کا تصوّر کیا اور ہر طرف اسے وہ کچھ نظر آیا جس پر صرف ہنسا ہی جا سکتا ہے۔ ہنسنے کا اِردگرد اتنا سامان ہوتے ہُوئے کوئی کیوں پوچھے کہ کیوں ہنس رہے ہو اور کیوں بتانے کی ضرورت پیش آئے کہ ہم کس وجہ سے ہنس رہے ہیں۔ اسے تعجب ہوا کہ فی زمانہ ہنسنے کا اتنا وافر سامان موجود ہے، پھر بھی ہم کتنا کم ہنستے ہیں۔ جیسے ہمارے نہ ہنسنے سے صورتحال کی مضحکہ خیزی جاتی رہے گی۔

گھر پہنچ کر اس نے حالات کو بہُت سازگار پایا۔ اب نقشہ صبح سے بالکل مختلف تھا۔ بیوی باورچی خانہ میں مصروف تھی۔ رات کے کھانے کی ہنڈیا خاصی دیر سے چڑھائی گئی تھی۔ اسے اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اس کے پاس آکر بیٹھتی۔ اس تنہائی کو اس نے بہُت غنیمت جانا۔ تنہائی بھی کتنی غنیمت ہوتی ہے۔ ایسے میں کہ کوئی دیکھنے والا نہ ہو کہ آپ کیا کر رہے ہیں آدمی کتنا آزاد محسوس کرتا ہے۔

اس نے یوں ہی ریڈیو آن کر دیا۔ سوئچ گھمانے لگا کبھی ایک سٹیشن لگا یا کبھی دوسرا اسٹیشن۔ کوئی خاص سٹیشن لگانا اور سننا مقصود نہیں تھا وہ تو بس تفریحاً سوئچ گھما رہا تھا۔ ایک سٹیشن سے ڈرامہ ہو رہا تھا۔ ڈرامہ کومیڈی کی قسم سے تھا کچھ دیر اس نے ڈرامہ سنا اور خوش ہُوا۔ پھر اس نے سوئچ گھمایا دوسرا اسٹیشن لگ گیا یہاں بچّوں کی کہانی ہو رہی تھی۔ سننے والے بچّے بیچ بیچ میں کھلکھلا کر ہنستے۔ پھر اس نے سوئچ گھما دیا۔ ایک اور سٹیشن لگ گیا۔ کچھ گانے بجانے کا پروگرام ہو رہا تھا۔ گانے بجانے والی ٹولی ترنگ میں تھی۔

جو سٹیشن بھی لگ جاتا یہی اسے احساس ہوتا کہ وہاں سے خوشی نشر ہو رہی ہے۔ دُنیا میں لوگ کتنے خوش ہیں۔ اس نے دل میں کہا۔ ہاں دنیا میں لوگ کتنے خوش ہیں، وہ بڑبڑایا اور اداس ہو گیا بغیر کسی سبب کے۔

مشق

۱۔ اس کہانی کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

۲۔ اس کہانی کا کردار کیوں ہنسنا چاہتا تھا؟

۳ - کہانی کے کردار نے کہاں کہاں یہ محسوس کیا کہ وہ آزادی سے ہنس سکتا ہے؟

۴ - کیا اس کہانی کا کردار اپنی خواہش کے مطابق دل کھول کر ہنس سکا؟ نہ ہنس سکنے کی وجہ بتائیے۔

۵ - ریڈیو کے پروگراموں سے کہانی کے کردار نے کیا محسوس کیا؟

۶ - کہانی کا کردار اداس کیوں ہو گیا؟

۷ - درج ذیل عبارت میں مناسب جگہوں پر ضروری رموز اوقاف لگائیے۔

سورج کی روشنی کے ڈر سے ارغوانی رنگ کی بدلیاں دھیرے دھیرے قبیلے کی سمت پھیل رہی تھیں مشرق کی اور سُرخ رنگ میں ڈوبے ہُوئے کوہسار اور افق اپنی سرخی رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے جدا کر رہے تھے سورج کی آنکھ نیلے دھوئیں میں لپٹے ہُوئے پہاڑوں کا جائزہ لے رہی تھی لیکن جب سورج کی غصے بھری آنکھ طلوع ہُوئی تو سبزہ زاروں پر پڑی ہُوئی اوس ڈر کے مارے بھاگنے لگی اور پہاڑوں کے زینہ بہ زینہ بکھرے ہُوئے باغوں میں رونق سی پیدا ہو گئی بچّوں بوڑھوں اور جوانوں نے اپنے اپنے ٹوکرے سنبھالے اور دامن کہسار میں پھیل گئے رنگا رنگ کپڑوں میں ملبوس لوگ ہریالی میں پھلوں سے بھرپور پیڑوں کے اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔

۸ - اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

عود کر آنا، باچھیں کھلنا، ہڑبڑانا، ٹس سے مس نہ ہونا، دماغ چل جانا، سنک جانا، مضحکہ اُڑانا، غنیمت سمجھنا، ترنگ میں ہونا،

۹ - مناسب حروف لگا کر جملے مکمل کیجیے۔

(ا) اس ـــــ برتن باورچی خانے ـــــ رکھے اور فوراً واپس آ گئی۔

(ب) راحت ـــــ آج دفتر دیر ـــــ جانا تھا۔

(ج) میں ـــــ بجلی کے بل کی رقم مینیجر ـــــ حوالے کر دی۔

(د) تنہائی نصیب ہوتے ہی ہیں ـــــ سوچا کہ اب میں آزادی ـــــ ہنس سکتا ہوں۔

(ہ) کوئی کام نہ ہو تو بہتر ہے کہ گھر ـــــ اطمینان ـــــ بیٹھیں۔

ایک کہانی بڑی پرانی

(ہاجرہ مسرور)

بڈھے نوکر نے دروازے میں سے سر نکال کر پھر کچھ کہنا چاہا۔

"افوہ! ابھی بہت سن لیں تمھاری باتیں۔ میرا دماغ نہ کھاؤ۔ میرے گھر رہنا ہے تو جیسا میں کہوں وہی کرنا ہوگا ورنہ ـــــ" دروازہ بند ہوتے دیکھ کر وہ چپ ہوگئیں۔ اُن کے ہاتھ لرز رہے تھے، غصّے سے یا شاید سردی سے۔ کھڑکی کے شیشوں پر سے پرانی ساڑی سے بنا ہُوا پردہ بھی ہٹا ہُوا تھا۔ پھر بھی کہر کے مارے ہُوئے سورج کی روشنی میں کمرا اندھیرا لگ رہا تھا۔ اُنھوں نے پلاسٹک کی سلائیوں پر اُون کے پھندوں کو آنکھوں کے قریب لاکر گننا شروع کیا۔

"بیگم صاحب" بڈھے نوکر نے کمرے کا دروازہ پھر کھولا اور اندر آگیا۔ اب اُس کے ہاتھ میں چادر میں بندھی گٹھری تھی۔

"پھر جانے کی دھمکی دے رہے ہو بخشو میاں۔ تم سمجھتے ہو میرے ہاتھوں میں دم نہیں ـــــ پھر تم ہو کس کام کے؟ جیسا پکاتے ہو خوب معلوم ہے۔ میں نہ دیکھوں تو بھلا کوئی پیٹ بھر کر کھا سکتا ہے۔ بازار سے سودا سلف لا دیا اور بچّوں کو سکول سے لے آئے تو سمجھتے ہو گھر کے سارے کام نمٹ گئے۔ سارا دن تو میں ہی مرتی کھپتی ہوں گھر کے کاموں میں ـــــ واہ اچھی دھمکیاں ہیں جانے کی۔"

دھپ سے گٹھری فرش پر پھینک کر بخشو میاں اکڑوں بیٹھ گئے اور گٹھری کی گرہ کھول دی۔

"لو دیکھ لو کچھ لے کر نہیں جا رہے تمھارے گھر سے۔ بعد میں نہ کہنا۔"

"بس بس دیکھ لیا ـــــ ہاں یہ سوئیٹر رکھ دو میں نے نیا بن کر تمھیں دیا تھا۔ تمھیں ہماری پروا نہیں تو ہمیں بھی نہیں۔ اب جو یہاں کام کرے گا وہ پہنے گا اسے۔ ہنھ کتنا کتنا ہی خیال کرو تمھارا کوئی فائدہ نہیں۔ ناقدرے ہو۔"

وہ بے حد چڑچڑا کر بولتی گئیں لیکن جب بڈھا نوکر گٹھری باندھ کر سچ مچ چل پڑا تو انھیں ایک دم شدید کمزوری کا احساس ہُوا اور گھبراہٹ سے کھانسی اُٹھنے لگی۔ کھانستے کھانستے اُن کے دل میں نوکر کے لیے رحم کی ایک لہر سی اٹھی۔ اُنھوں نے گرم لحاف ایک طرف الٹا اور سوئیٹر اُٹھا کر دروازے کے باہر صحن میں اُچھال دیا۔

"بخشو یہ لے جاؤ اپنا سوئیٹر۔ ایک دفعہ جو دے دیا سو دے دیا ـــــ" اور پھر وہ کھلے دروازے میں کھڑی رہ گئیں۔ بڈھے نوکر کے لیے جیسے اُن کا دل پگھلنے لگا، جی چاہا اُسے روک لیں، منالیں۔ اب یہ اس عمر میں کہاں محنت کرے گا۔ یہ بے چارہ تو ان کی شادی سے پہلے ان کے میاں کے پاس تھا۔ تنخواہ بھی کیا لیتا بس پان سگریٹ

کا خرچ، کھانا کپڑا، دوا علاج اور سر پر چھت اس کے لیے بہت۔ عجیب سادھوؤں اور تیاگیوں جیسا رویہ تھا اس کا۔ ناراض ہوتا تو کچھ دن کے لیے اپنی گٹھری لے کر چلا جاتا، دو چار گھروں میں رہ کر اور وہاں سے بھی روٹھ کر پھر یہیں واپس آجاتا ہے ـــــ بےچارہ! مگر وہ سوچتی رہیں۔ کچھ کہہ نہ سکیں۔ کھانسی ایسی مُنہ بھر کر آئی کہ وہ غسل خانے کی طرف دوڑیں۔ کھانس کر تھوکا تو بلغم پر خون کی سرخ دھاری چمکی ـــــ گھڑگھڑا کر جیسے چلتی ریل گاڑی پٹڑی پر رک گئی، کانوں میں انجن سنسانے لگا۔ انھوں نے ذہن کی کھڑکی سے جھک کر دیکھا وہی سینی ٹوریم والا اسٹیشن۔

وہ گھبرا کر پلٹیں اور لحاف میں خوفزدہ بچے کی طرح چھپ کر بیٹھ گئیں اور پھر اُون سلائیاں نظر آئیں تو کچھ یوں تیزی سے بُننے لگیں جیسے اُون کے یہ پھندے اُن کے آوارہ خیالات کو بھی جکڑ لیں گے۔ زکام ہے زکام بگڑ گیا ہے شاید۔ ایسے میں گلے سے خون آجاتا ہے۔ مگر میں اتنی چڑچڑی کیوں ہو گئی ہوں؟ شاید بخار ہے! اُنھوں نے ایک خُوب گہری سانس لی جو ان کے ہونٹوں اور ٹھوڑی پر لو کے جھونکے کی طرح لگی۔ اُون اور سلائیاں تپائی پر ڈال کر وہ اُٹھیں اور دیواری الماری کھول کر کچھ ڈھونڈنے لگیں ـــــ نہ جانے عورتیں اپنی چیزیں اس قدر بند کر کے کیوں رکھتی ہیں؟ تالے والی الماری اور اس کے اندر بند ڈبے ـــــ تالے والی چھوٹی چھوٹی صندوقچیاں

ٹافی کے خالی ڈبے، بڑے مُنہ کی بوتلیں۔ کسی میں جہیز کے کپڑوں سے اتارا ہوا لچکا گوٹا کسی میں سلمے ستارے کی بیلیں، کسی میں شیشے کی چوڑیاں، کسی میں جھوٹے نگوں کے نقلی زیور اور کہیں گھریلو دواؤں کی شیشیاں ـــــ مگر وہ یہ چیزیں تو نہیں ڈھونڈھ رہی تھیں۔ آخر ایک بڑے سے پھولوں اور تتلیوں کی چھاپ والے ڈبے میں وہ اُلٹ پلٹ کرنے لگیں۔ اس میں نکاح نامہ تھا۔ میاں کے کچھ خطوط جو انھوں نے ٹریننگ کے لیے دوسرے شہر جا کر بڑی محبت سے لکھے تھے۔ دواؤں کے نسخے اور بچوں کے سکول کی سالانہ رپورٹ کے علاوہ ان کا اپنا میٹرک سرٹیفکیٹ بھی نظر آگیا مگر وہ چیز نہ ملی جسے وہ اتنی بے تابی سے ڈھونڈھ رہی تھیں۔ آخر الماری کے ایک کونے میں بیکار کپڑوں تلے ٹین کا وہ ڈبہ مل گیا جس میں اُن کی مرحومہ ماں کی یادگار چاندی کی سرمے دانی کے ساتھ تھرمامیٹر بھی رکھا تھا۔ اُنھوں نے کانپتے ہاتھوں سے تھرمامیٹر نکالا اور ایک بار جھٹک کر مُنہ میں رکھ لیا ـــــ بند آنکھوں کے سامنے سے دھڑکتے ہُوئے دل پر بھاری بھاری قدم رکھتے گیلن سی چبھوتے وہ سارے دن گزرنے لگے جن میں وہ اپنے میاں اور بچوں سے دور سینی ٹوریم کے جنرل وارڈ میں پڑی تھیں، جہاں سارے وقت ان کا ذہن بچوں اور شوہر کے لیے طرح طرح کے وسوسے بنتا رہتا۔

خدا جانے اب جوتے بھی کیسے بننے لگے ہیں کہ چاپ بھی نہیں سنائی دیتی ـــــ وہ پُشت پر آکر کھنکھارے تو آنکھوں کے ساتھ مُنہ بھی کُھل گیا اور تھرمامیٹر زمین پر ٹپک پڑا۔

"میں نے کہا زکام ہے دیکھوں بخار تو نہیں کم بخت ٹوٹ گیا نیک شگون ہے۔" وہ بے فکری دکھا رہی تھیں۔

سوچ رہی تھیں، جب انھیں پرواہی نہیں تو کیوں اپنا دکھڑا روؤں۔

"بخشومیاں کو پھر نکالنے کی کوشش ہے، وہ تو میں دفتر نہیں گیا تھا جو روک لیا۔" انھوں نے بے تعلقی سے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں کہا۔

"میں نے تو نہیں نکالا کسی کو۔ خود گٹھری باندھ لائے ——" وہ بھی اسی طرح بولیں جیسے کسی اَور سے کہہ رہی ہوں۔ وہ دن پہلے کے جھگڑے کے بعد یہی صورت حال تھی؟ اور جھگڑے تو اب بار بار ہی ہوتے۔

"شام کو کچھ لوگ آئیں گے بخشومیاں۔ بازار سے سموسے لے لینا درجن بھر، گھر میں تو کوئی ڈھنگ کی چیز بن نہیں سکتی، چائے ہی ٹھیک بنا سکو تو بنا لینا۔" انھوں نے باورچی خانے کا دروازہ کھول کر کہا اور پلٹ کر دوسرے کمرے میں جانے لگے۔

"واہ میری بھی تو کوئی عزت ہے۔ اب اِن کی خوشامدیں ہوں گی تو اور میرے سر پہ ناچیں گے۔ جیسے بخشو میاں ہی تو یہ گھر چلا رہے ہوں۔ اپنی جان کھپا دی اور یہ صلہ ملا ہے مجھے ——" وہ زور زور سے بولتی میاں کے پیچھے آئیں۔ مگر وہ میز پر سے دفتر کی فائلیں اُٹھا کر باہر نکل گئے۔ میاں نے باہر سکوٹر نہیں سٹارٹ کیا جیسے ان کے ذہن پر لات ماری ہو۔ ایسی لات جس سے ان کے دماغ کے سارے کل پرزے چل پڑے۔

"خدا سمجھے!" وہ کرسی پر بیٹھ کر پھسر پھسر رونے لگیں۔

"ہمیشہ وہی چاہیں گے جو میں نہ چاہوں۔ ہمیشہ مجھے ذلیل کریں گے دوسروں کے سامنے"! انھوں نے دوپٹے سے ناک پونچھی اور دل کھول کر رونے لگیں۔ نیم تاریک ٹھنڈے کمرے میں گرم گرم آنسوؤں سے انھیں بڑی طمانیت کا احساس ہُوا۔

"یہ دیکھو! یہ جھاڑ پونچھ کی ہے بخشو نے حضور کے کمرے کی ——" انھوں نے جیسے میاں کو مخاطب کیا اور روتی ہُوئی اُٹھیں اور میز کی سطح پر جمی ہُوئی گرد کی تہہ کو انگلیوں سے صاف کیا اور پھر جھنجھلا کر انھوں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے ہی سارا فرنیچر پونچھ ڈالا۔

"لو ذرا دیکھو اگر میں اس وقت دھیان نہ دیتی تو یوں ہی خاک جمی رہتی۔ پھر جو آتا میری صحت کے قصے لے بیٹھتا۔ ہمدردیاں جتاتا ——" طنطنے میں انھوں نے کمرے کی صفائی کر ڈالی، بانس لا کر چھت کا جالا لے ڈالا، مگر روشن دان میں لگے چڑیا کے گھونسلے سے آنکھ بچا گئیں۔ کم بخت چڑیوں نے نہ جانے کب روشن دان کی ذراسی کھلی درز پا کر تنکے پھنسا لیے —— اور اب تو اس میں بچے چوں چوں کر رہے تھے۔ ان کے میاں نے بھی بخشو کو ہدایت کر دی تھی کہ اب گھونسلہ نہ چھیڑنا ورنہ بد دعا لگے گی چڑیوں کی —— گھونسلے کو نظر انداز کر کے انھوں نے پردے جھٹک کر دھول نکالی۔ ابھی چند ہفتے پہلے ہی تو اُنھوں نے گھر کے خرچ میں سے پیسہ

پیسہ بچا کر یہ اچھے خاصے مہنگے پردے سلوائے تھے۔ اب بچت کوئی سینکڑوں کی تو تھی نہیں۔ یہی انڈوں میں گوشت میں، دُودھ میں ڈنڈی مارلیتیں۔ ڈاکٹر نے انھیں انڈا دُودھ مکھن روز کھانے کی ہدایت کی تھی۔ مگر وہ یہ چیزیں کھاتی رہتیں اور پردے نہ بنتے تو وہ اور بیمار نہ ہو جاتیں۔ ڈاکٹر نے یہ بھی تو کہا تھا کہ خوش رہا کرو ـــــ گھر بنا تو خوش ہُوئی اب نئے گھر میں سب پرانی چیزیں تو اچھی نہیں لگتیں۔ اس لیے ایک پردے ہی کیا یہ میز یہ کرسیاں، یہ صوفہ بھی تو انھوں نے ہی خریدا تھا۔ یہ کمرا تو انھیں اتنا عزیز تھا کہ بچّوں کو یہاں گھسنے نہ دیتیں مگر یہ بڑے میاں بخشو ہیں کہ انھیں چیزوں کی اہمیت اور قدر کا پتا ہی نہیں۔

بڑی دیر تک وہ کھانس کھانس کر کمرے کی صفائی کرتی رہیں۔ کرسیوں کی ترتیب بدل ڈالی، دیواروں پر لگی بچّوں، میاں اور اپنی تصویریں گیلے کپڑے سے پونچھیں اور پھر تصویر کے سامنے دیر تک کھڑی رہیں۔ سب جھوٹ تھوڑا ہی کہتے ہیں کہ میں خوبصورت ہُوں۔ انھوں نے مسکرا کر سوچا۔ انھیں اپنی تصویر دیر تک دیکھنے سے بڑی طمانیت اور اعتماد محسوس ہُوا۔

جب وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آئیں تو انھیں خیال آیا کہ سوئیٹر تو بنا ہی نہیں۔ بس اب اس کا گلا ہی تو بننا رہ گیا تھا۔ وہ دوبارہ بُننے بیٹھ گئیں۔ جو آئیں گے دیکھیں گے کہ بے چارہ پپو کیسا پرانا گھسا سوئیٹر پہنے ہے۔ بے چارہ بچہ! کتنے دن لگ گئے تین سوئیٹروں میں ـــــ وہ بُنتی گئیں اور ذہن میں پھندے سے کھلتے گئے۔

"میں شاید بہت چڑچڑی ہو گئی ہوں۔ پرسوں خواہ مخواہ ہی تو اُن کی جلی کٹی باتوں کا جواب اس طرح دینے لگی۔ پتا نہیں کیوں میں جب سے بیمار ہُوئی ہوں سمجھتی ہوں وہ میرے نہیں رہے۔ ہر بات میں میری کاٹ کرتے ہیں۔ اب آج ہی بخشو میاں کا معاملہ دیکھو میں نے کہا جاتے ہو جاؤ ـــــ انھوں نے حکم دیا 'رکو' ذرا میرا خیال نہیں انھیں ـــــ" ذلت کے خیال سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"مر جاؤں گی تو چُھٹی ہو جائے گی۔ پھر قدر ہو گی میری۔ میاں جی کو ـــــ" ہاتھ روک کر بہتے آنسوؤں کو پلو سے پونچھنے سے پہلے سُرخ سوئیٹر پر آنسوؤں کے چند قطرے گر گئے۔

"ہائے اللہ توبہ!" انھوں نے سوئیٹر جلدی سے سینے سے لگا لیا۔ "میں مر جاؤں گی تو میرے دونوں بیٹوں کا کیا ہو گا۔ بھوکے پھریں گے تو باپ کو خبر نہ ہو گی۔ ننگے پھریں گے تو کسی کو خیال نہ آئے گا۔ وہ جو شل ہے۔ باپ لکھیا نہیں بھلا ماں پسنہاری بھلی ـــــ توبہ!" بچّوں کے اس انجام کے تصور سے ہی وہ کانپ اُٹھیں۔

"دونوں بچے سکول سے لانے کا وقت ہو رہا ہے۔ جانے بخشو نے کچھ پکایا بھی یا نہیں۔ ارے آج تو وہ پیسے بھی دے کر نہیں گئے۔ غصّے میں بھول ہی گئے حضور والا ـــــ" وہ گھبرا کر اُٹھیں۔

ایک بار پھر الماری کھلی۔ ڈبے کھلے اور خاصی ریزگاری مل گئی۔ انھوں نے باورچی خانے میں جھانکا۔ ریزگاری

بخشو میاں کو دے کر جلدی سے انڈے لانے کو کہا اور خود انڈے کا سالن بنانے کے لیے پیاز کاٹنے بیٹھ گئیں۔
سر میں دھمک سی ہو رہی تھی اور کھانسی بدستور اُٹھ رہی تھی ——— کھانا پک گیا۔ بچے سکول سے آگئے چھوٹے پپو نے کھانا کھا کر خوشی خوشی نیا سوئیٹر پہن لیا ——— بخشو میاں بازار سے سموسے بھی لے آئے۔
جب شام کو ان کے میاں آئے تو وہ نیند میں پسینے سے نہا چکی تھیں۔ نہ جانے کب سو گئی تھیں اور اب باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا ——— اُنھوں نے اُٹھنا چاہا مگر اُٹھا نہیں جا رہا تھا ——— اُنھیں صحن میں میاں کے رشتے کی پھوپھی اور ان کی پولیو سے لنگڑی بیوہ بیٹی کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر پڑوسن خالہ اور ان کے شوہر کے بولنے کی جانی پہچانی آوازیں آنے لگیں ———
"ہاں تو یہ ہیں ہماری قسمت کے مہمان۔ مجھے معلوم تھا جب لڑیں گے تو منصفی کے لیے انھی لوگوں کو بلائیں گے اور وہ ان کے کلرک دوست بھی تو آئیں گے ہاں میں ہاں ملانے ———" اُنھوں نے بہ مشکل گھسیٹ کر اپنے آپ کو اُٹھایا کھانستی ہوئی غسل خانے میں گئیں، مُنہ ہاتھ دھویا، دوپٹہ بدلا اور بچّے کی کھانسی کا شربت گھونٹ بھر پی گئیں ——— کہ اب یوں ہی کھانسی رہی تو کھانسی کا حساب کتاب کسے کسے سمجھائیں گی ——— اور پھر اندر ہی اندر کانپتی، اُلٹے ہُوئے لحاف سے ٹک کر یوں بیٹھ گئیں جیسے کہیں کی ملکہ ہوں اور اب مہمان انھیں سلام کرنے حاضر ہوں گے۔ مگر غصّے اور ہتک کے احساس سے ان کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر نکل پڑے گا۔
"میں کیوں جھگڑی ان سے۔ وہ تو بس میرے سینی ٹوریم سے آنے کے بعد سے پتھر بن گئے ہیں۔ کچھ کہوں سنتے ہی نہیں۔ پھر میں سنانے کو کیوں مری جاتی ہوں۔ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کہیں وہ ان سب کے سامنے یہ نہ کہہ دیں کہ میں رات کو اُن سے جھگڑ کر ان کے کمرے کے فرش پر پڑی روتی رہی تھی کہ شاید منائیں گے ——— مجھے ان کے کمرے میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ نہیں بولتے نہیں پوچھتے، نہ سہی ——— اللہ نے دو بیٹے دیے ہیں۔ یہ سلامت رہیں گے۔ بچے کیا ماں کی باتیں، حرکتیں نہیں سمجھتے؟ بڑے ہو کر خود فیصلہ کریں گے میرا اُن کا۔ نہ بولیں نہ پوچھیں ـــ"
دوسرے کمرے میں اُن کے میاں بول رہے تھے۔
"دیکھ لیجیے! مزاج، صبح سے بتا دیا تھا کہ آپ لوگ آئیں گے۔ مجھ سے ناراض تو دنیا سے ناراض ———"
اپنے میاں کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے وہ کمرے میں حاضر ہو گئیں۔ وہی چھلکتی سی نیم وا آنکھیں، بخار سے تمتمایا ہُوا رنگ۔ سموسوں کی پلیٹ اُن کے ہاتھ میں تھی۔
"آ ئیے بیٹھو بیٹی۔ بخشو میاں لے آئیں گے چائے وائے ———" پھوپھی دیوان پر ایک طرف کھسک گئیں۔
"بخشو میاں؟ ارے پھوپھی شکر کیجیے وہ تو میں گھر میں موجود تھا ورنہ یہ تو اسے بھی دھکا دے چکی تھیں" میاں نے بڑے جوش سے سبھوں کو اطلاع دی اور داد طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

اور وہ بمشکل خود کو چیخ کر بولنے سے روک سکیں۔
"آپ کو تو معلوم ہے پھوپی، بخشو میاں کی عادتیں۔ جب چاہیں رہیں جب چاہیں گٹھری باندھ کر نکل جائیں۔"
وہ آہستہ سے بولیں۔
"ہاں یہ بات تو ہے۔ خدا لگتی کہوں گی، ایک دفعہ تمہارے ہاں سے روٹھ کر میرے گھر بھی تو ڈیرہ ڈالا تھا۔ لو ہفتہ نہیں رہے کہ خود ہی روٹھ کر کہیں اور چلے گئے۔ بس بے چارے بخشو بوڑھے ہو گئے بہت۔ اور پھر بیٹا یہ نوکروں کا ______"
پھوپھی بخشو میاں کے قصے میں الجھ گئیں ادھر خود بخشو میاں اپنے بچے کھچے دانت نکالے چائے کی کشتی اندر رکھنے آ گئے۔
چائے پیالیوں میں ڈالتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں "کتنے دن سے چائے کی ٹرالی لینے کو جی چاہتا ہے مگر ریزگاری اتنی نہیں جمع ہونے پاتی۔ جب دیکھو جب مہنگائی کا رونا روتے رہتے ہیں اور گھر کا روزانہ خرچ دینا بھول جاتے ہیں۔"
سب مہمان چائے پینے اور سموسے چکھنے لگے۔ کمرے میں پیالیوں اور چمچوں کی آواز چھا گئی۔ اچانک کمرے میں ایک چڑیا روشن دان کے شیشے سے ٹکرائی۔ انھوں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا جالے اتارتے ہوئے روشن دان کی درز شاید بالکل بند ہو گئی تھی اور چڑیا جو اندر آ گئی تھی باہر نہیں نکل پا رہی تھی۔
"پوچھیے ______ آج پھر پوچھیے ان سے ______" میاں نے پھوپھی کو صحیح پٹڑی پر ڈالنے کی کوشش کی۔
"دُوسروں سے پوچھواتے ہیں۔ کبھی آپ نے بھی پُوچھا ہوتا ______" وہ نہیں بولنا چاہتی تھیں پر بول پڑیں۔
"اے لو بیٹی ہم دُوسرے ہو گئے ہم تو اپنا سمجھ کر آ جاتے ہیں۔" رشتے کی پھوپھی بُرا مان کر مُنہ بسورنے لگیں۔
"ارے نہیں پھوپھی میں ایسی بات نہیں کہہ رہی۔ میں تو ان سے کہہ رہی ہوں آپ کے بھتیجے سے ______"
اُنھوں نے کپکپا کر پُرانی گرم چادر اپنے گرد زور سے لپیٹ لی جیسے چادر تلے خدا جانے کیا کیا چھپا رہی ہوں۔
"تمھیں کیا نہیں پوچھا، تمہارے پاس کیا نہیں؟ تمھیں کیا سڑک پر بٹھا رکھا ہے؟ شکر نہیں کرتیں نئے مکان میں بیٹھی ہو۔ تمھیں کھانے کو نہیں ملتا؟ پہننے کو کپڑا نہیں؟ دوا علاج نہیں ہوتا؟ اور کیا پوچھوں، بتاؤ نا" میاں کی آواز بلند ہونے لگی۔
"ہاں ہاں بیٹی جو کہنا ہے کہو ______" پڑوسن خالہ کے شوہر نے رسان سے کہا۔
"گھر کے طعنے رات دن سنتی ہوں جیسے گھر اُنھوں نے بنوایا ہو کھڑے ہو کر۔ ارے میں نہ ہوتی تو یہ گھر بنتا؟ اپنا پیٹ کاٹا، اپنا جی مارا۔ پیسہ پیسہ دانتوں سے پکڑا جب یہ گھر بنا ہے۔ میں نے تو اپنے پراویڈنٹ فنڈ کا پیسہ

بھی اسی میں ڈالا۔ چھ تولے سونے کا سیٹ تھا میرے جہیز کا وہ بھی بیچ کر اسی میں لگا دیا۔" وہ بولتی چلی گئیں۔

"سن لیا آپ لوگوں نے؟ اتنی چھچھوری طبیعت ہے ان کی۔ آج کھلیں سب کے سامنے۔ ہم نے انھیں کھلایا پہنایا، دوا علاج کے لیے رات دن کی بیمار۔ آج یہ زیور اور روپے کا طعنہ دے رہی ہیں۔ کیا میں نے تم سے روپیہ زیور مانگا تھا؟ قسم کھا بچّوں کے سر کی ——"، میاں آگ بگولہ ہو گئے۔

"ہر بات کا غلط مطلب نکالتے ہیں۔ میں تو کہہ رہی تھی، میں نے اس گھر کے لیے، آپ کے لیے سبھی قربان کر دیا اور آپ ہیں کہ میری ذرا پروا نہیں۔ میں نے آپ کے کہنے پر اپنی دس سال کی سکول ٹیچری بھی چھوڑی شادی کے بعد ——" وہ بھی بولتی گئیں۔

"ارے بی بی نیک بخت عورتیں اپنے گھر کے لیے ایسا ہی کرتی ہیں۔" بوڑھے کلرک نے کہنا شروع کیا "میری بیٹی نے تو ——"

کلرک کی بیٹی کی قربانیوں کی فہرست لمبی تھی، جسے وہ اپنے کھولاؤ میں نہیں سُن رہی تھیں۔ وہ تو کمرے میں موجود چڑیا کی طرح ہراساں تھیں جواب باہر کی راہ نہ پا کر بار بار سب کے سروں پر اُڑ رہی تھی۔

"ہاں سچ تو ہے اس میں گنانے کی کیا بات ہے یہ تو بیٹا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اب تو خیر سے مرد اتنے شوقین بھی نہیں رہے۔ بہُت ہُوا تو سینما دیکھ آئے، دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں میں چائے پی لی۔ ہمارے میاں نے نولاکھ کا گھر خاک کر دیا تھا۔ ہمارا ڈھیروں زیور گانے بجانے والیوں کو پہنا دیا۔ اس پر بھی یہی کہنے کہ اپنے باوا کے گھر سے اور لاؤ۔ اللہ جنت نصیب کرے ان میں کون سی لت نہیں تھی؟ ہا ہا آ —— اور یہ تمھارا میاں بے چارہ گھر سے دفتر —— دفتر سے گھر —— ارے شکر کیا کرو۔ ایسا بھولا بھالا میاں ملا ہے۔ ایک ہماری اس بیٹی نے بھگتنا تھا ——" انھوں نے اپنی پولیو زدہ بیٹی کو دیکھ کر لمبی آہ بھری۔

"گھر میں بھی آئیں گے تو جیسے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ کبھی گھر کا حال پوچھا دو برسوں میں۔ جب سے میں بیمار ہُوئی تو" اُن کی آواز بھرّا گئی۔

"ہاں! ہاں!! اور خوب غُل مچاؤ۔ آنسو تو تمھاری پلکوں پہ دھرے رہتے ہیں۔ جب گھر میں آؤ مُنہ سوجا ہُوا دیکھو۔" وہ تڑخ کر بولے اور بولتے چلے گئے۔

"کبھی تم نے پوچھا کہ میرا کیا حال ہے؟ میری کیا پریشانیاں ہیں۔ دفتر کے کیا حالات ہیں۔ مکان کا قرض سر پہ چڑھا ہُوا ہے۔ صاحب! یہ تو چاہتی ہیں کہ گھر میں بیٹھا اِن کا مُنہ دیکھتا رہوں۔ اِن کے قصیدے پڑھتا رہوں ——" وہ بولتے گئے —— تو وہ ایک دم چیخ اُٹھیں۔

"دیکھیے حد ہوتی ہے۔ بس کیجیے۔ یہ قصیدے پڑھیں گے میرے؟"، انھوں نے آنسو ضبط کیے۔

"دیکھا آپ لوگوں نے؟ دیکھا۔ سیدھی بات ہے یہ مجھ سے بے زار ہوگئی ہیں۔ میں ٹکٹ لے آیا ہوں ریل کا۔ یہ دو ایک مہینے اپنی بہن کے پاس رہ آئیں۔ کراچی میں سردی بھی نہیں ــــــ بچوں کو پھوپھی آپ سنبھال لیجیے گا۔" میاں نے قصہ تمام کیا اور ایک سموسہ اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگے۔

"میں کیوں جاؤں کسی کے گھر اپنا گھر چھوڑ کر؟ اپنے بچے چھوڑ کر؟ اور پھر چھوٹی بہن کی سسرال میں؟ یہ بھی خوب رہی۔ میرا بھائی ہوتا تو شاید جانے کا ٹھکانہ ہوتا ــــــ" وہ ایک دم پھپھک کر رو پڑیں۔

"اے ٹھیک تو کہہ رہی ہے یہ۔ بھائی باپ کے گھر جانا تو ٹھیک ہوتا ہے مگر بہن کی سسرال میں تو ــــــ" پڑوسن خالہ بول پڑیں۔

"بہن آکر نہیں رہی تھیں ایک مہینے۔ اے اب ایسا بھی کیا؟" پھوپھی بولیں اور بولتی چلی گئیں۔ "بھئی آج کل کی عورتیں بھی خوب ہیں۔ اے ہم تو جب بیزار ہوتے تھے تمہارے پھوپھا سے تو بہن بھائی، خالہ، ممانی، چچی جس کے گھر جی چاہا اپنے بچے سمیٹ کر مہمان ہو جاتے۔ پھر کچھ دیر بعد خود ہی منانے آتے اللہ بخشے۔ ہماری اماں کہتی تھیں اس طرح بیوی کی قدر ہو جاتی ہے میاں کو ــــــ"

"یہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کے لیے کیا نہیں کیا۔ ہانڈی سے اچھی بوٹیاں اُن کو دیں، گھی کا تار ان کے برتن میں ڈالا۔ اِن کے کپڑے دھوئے۔ استری کی، جوتے پالش کیے۔ ارے ہم نے تو کبھی کوئی جمعدارنی بھی صفائی کے لیے نہیں رکھی۔ میں نے گھر کے خرچ میں سے پیسہ پیسہ جوڑا اور اس گھر پر خرچ کیا۔ کیا کچھ نہیں کیا؟ بچے پالے کبھی بچوں کی بیماری آزاری میں نہیں کہا کہ دفتر سے چھٹی لو اور اب کہہ رہے ہیں کہ میں چاہتی ہوں یہ گھر بیٹھ کر میری صورت تکیں ــــــ ارے کبھی تو پوچھیں کہ مرتی ہو یا جیتی ہو؟"

"ارے بیٹی اللہ نے عورت کو اتنی ہمت دی ہے کہ سب کرتی ہے۔ اس کا کیا ذکر کرنا ــــــ؟ میری بیٹی نے تو ــــــ" بوڑھے کلرک نے پھر اپنی بیٹی کا ذکر چھیڑا مگر کسی نے اُدھر توجہ نہ دی۔

"تمہارا کیا حال پوچھیں سدا کی بیمار۔" میاں مُنہ لٹکا کر بولے۔

"میں سدا کی بیمار تھی؟ اللہ حد ہے جھوٹ کی بھی۔ میں تو تمہارے گھر آکر بیمار ہوئی ــــــ بس کیا کیا کہوں ڈاکٹر نے نہیں کہا تھا کہ ناقص غذا اور غم والم سے یہ بیماری ہوتی ہے ــــــ" وہ تڑپ کر زور زور سے رونے لگیں۔

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ سردی کا غروب ہوتا ہوا سورج بھی ایک بادل کے ٹکڑے کے پیچھے چھپ گیا اور کمرے میں اندھیرا بڑھ گیا۔ چڑیا اب کمرے میں بے تابی سے اڑی اور پھر روشندان کے شیشے سے ٹکرا گئی۔

"تم کتنا کتنا بیمار ہوئے میں نے کبھی کسی سے نہیں کہا۔ کسی سے فریاد نہیں کی، ڈاکٹر کہتا تھا کہ تمہاری خاندانی بیماری

تم میں اور بچوں میں ـــــ" وہ بین کر رہی تھیں کہ میاں کھڑے ہو گئے۔

"خبردار جو خاندان کی بات کی زبان کھینچ لوں گا ـــــ"

"دیکھ لیجیے اب خود جو چاہیں کہیں سب کے سامنے ـــــ" وہ زور زور سے رونے لگی۔

"اے بھابی! شریف عورتوں کی آواز گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے۔" پولیو زدہ نند نے اس کے مُنہ پہ ہاتھ رکھ دیا مگر وہ اس وقت اپنے آپے میں نہ تھیں انھوں نے وہ ہاتھ جھٹک دیا۔

"اچھی شرافت ہے یہ ساری دُنیا کو سنائیں اور میں نہ بولوں۔ سُن لیجیے یہ مجھے بوجھ سمجھتے ہیں۔ ان کا جی بھر گیا ہے مجھ سے۔ میری ہر بات انھیں بُری لگتی ہے اور میں نے اِن کے لیے کیا نہیں کیا ـــــ" وہ اسی طرح روتے ہُوئے بین کرتی رہیں۔

"چپ رہو ـــــ! میں کہتا ہوں چپ رہو۔ تم جاؤ اپنی بہن کے پاس۔ جاؤ سامان باندھو۔ جب تک میں نہ بلاؤں مجھے آکر صورت نہ دکھانا۔ وہ نہیں آکر رہی تھی تمھارے پاس؟" ـــــ وہ شیر کی طرح دھاڑے۔

"دو دن میری بہن آکر رہی تھی بے چاری کو ساس نے مارا تھا۔ نہ آتی تو کیا کرتی ـــــ اب یہ احسان جتا رہے ہیں۔ آخر یہ میرا گھر بھی تو ہے۔ میں نے اس میں اپنا پراویڈنٹ فنڈ ڈالا زیور ڈالا میں نے کوڑی کوڑی بچائی میں نہیں جاؤں گی اپنے گھر سے۔" وہ چیخی بالکل دیوانوں کی طرح۔

"آپ لوگ نہیں سمجھا سکتے اس عورت کو۔ یہ کسی کی سننے والی نہیں۔" میاں نے بے بسی سے سب کو مخاطب کیا۔

"تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ ـــــ اچھا میرے ساتھ آؤ۔" بڑوسن خالہ کا جی بھر آیا۔

"مگر خالہ میں کیوں جاؤں میرا کیا قصور ہے۔ ان کا دل کہیں اور اٹکا ہے یہ مجھے نہیں پوچھتے پھر کسے پوچھتے ہیں؟ میں سب سمجھتی ہوں ـــــ" وہ مچل مچل کر روتی اور کہتی رہی۔

"بھابی ـــــ اب بھیا ٹکٹ لائے ہیں تو دو چار دن کو کراچی ـــــ" پولیو زدہ نند نے سمجھانا چاہا۔

"میں نہیں جاؤں گی اپنی ہنسی اڑوانے۔ میں اپنے بچوں کو نہیں چھوڑ کر جا سکتی۔"

اس وقت گیند باہر سے آکر دروازے پر زور سے لگی۔

"ہاں توڑ دو دروازے دیکھیں گے تمھارے ابا اور بنوائیں گے۔ میری آنکھوں کے سامنے یہ حال ہے گھر کا۔" وہ جیسے ہسٹریا میں بک رہی تھی۔

"میں کہتا ہوں سامان باندھو ٹکٹ ضائع جائے گا جلدی ـــــ" ننھا اب کی دھیمی آواز میں مستحکم لہجے میں بولے۔

"نہیں جاؤں گی جانا ہے تو آپ بھی چلیے۔ بچے بھی چلیں۔" وہ اسی ہسٹریائی انداز سے کہے گئی اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور آنسو تھے کہ مُنہ دھو رہے تھے۔

اچھا ــــ تو پھر ــــ" میاں کی کیفیت بالکل آتش بازی کے انار جیسی ہو گئی جس کو دیا سلائی دکھا دی گئی ہو۔

"تو پھر ــــ تو پھر میں تم کو طلاق دیتا ہوں ــــ طلاق ــــ"

اور جیسے اس انار کے سارے جلتے پھول اُن پر برس گئے۔ پھر بھی نہ جانے کیسے اُن کا کانپتا ہوا ہاتھ بے اختیار آگے بڑھا۔ درمیانی گول میز جیسے انھیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ میز پر اوندھ گئیں اور جانے کیسے اُنھوں نے میاں کی پتلون کا پائینچا مضبوطی سے مٹھی میں جکڑ لیا اور کچھ کہنے کی کوشش میں ہانپنے لگیں ــــ آنکھوں اور ناک سے بہتا پانی کھلے ہونٹ اور اُجڑے بالوں میں چمکتے سفید بال وہ اس عالم میں کیسی بدصورت لگ رہی تھیں۔ سب نے نظریں جھکا لیں۔ میاں مُنہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔

پڑوسن خالہ نے اپنے آنسو خشک کیے بغیر، بڑا زور لگا کر انھیں میز پر سے اُٹھایا اور تلے کے کام والی بوسیدہ گرم چادر اُن کے سر پر ڈال دی۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا ــــ اب ان سے تمھارا پردہ واجب ہے ــــ" پڑوسن خالہ کے شوہر نے بمشکل کھنکھار کر بھاری آواز میں کہا اور سر جھکایا تو ان کی گہری سانس سے اللہ نکلا ــــ

انھیں رشتے کی پھوپھی نے بٹھا دیا کہ گر نہ پڑیں ــــ مگر وہ اپنی کلائی میں پڑی سونے کی تار جیسی دو چوڑیاں کھسوٹ کر اتارنے لگیں۔

"کیا یہ چوڑیاں آپ کے گھر کی ہیں جو اُتار رہی ہیں"۔ بوڑھے کلرک نے میاں سے سوال کیا۔

"جی! مگر جو دے دیا سو دے دیا۔ اُن سے کہیے چوڑیاں پہنے رہیں" میاں نے مدھم آواز میں کہا۔

لیکن وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھیں۔ چوڑیاں اتار کر میز پر ڈال دیں اور پھر کانپتے ہاتھوں سے کانوں میں پڑی چھوٹی چھوٹی بالیاں بھی اُتار کر چوڑیوں کے بیچ میں رکھ دیں۔ مگر یہ بالیاں تو ان کے جہیز کی تھیں۔ پھر وہ کانپتی ہوئی کھڑی ہوئیں اور سر پر سے تلے کے کام والی چادر بھی اتار کر میز پر ڈال دی ــــ اور خاموشی سے دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

"ہے ہے بے چاری کا لڑکوں پر بھلا کیا حق ــــ ارے کوئی بیٹی ہی پیدا ہوئی ہوتی تو یوں اکیلی نہ نکلتی گھر سے ہا آ ــــ" پڑوسن خالہ نے سوچا اور اپنی آنکھیں اور ناک پونچھتی دوسرے کمرے میں ان کے پاس چلی گئیں۔

اب کمرے میں خاموشی اور سردیوں کی شام کا اندھیرا اُتر رہا تھا ــــ میاں نے ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بلب روشن کیا تو چڑیا پھر ہر طرف اُڑنے اور روشن دان کے شیشے سے ٹکرانے لگی ــــ میاں نے چڑیا کو دیکھا اور پھر باہر کھلنے والا دروازہ کھول دیا کہ چڑیاں گھونسلے تک پہنچنے کا راستہ خود تلاش کر لیتی ہیں۔

مشق

۱- اس افسانے کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

۲- خاتونِ خانہ کے کردار کے بارے میں ایک صفحہ لکھیے۔

۳- اس افسانے سے آپ کیا سبق اخذ کرتے ہیں؟

۴- آپ کے خیال میں ایسی ناپسندیدہ صورت حال سے بچنے کے لیے دونوں کرداروں کو کیا کرنا چاہیے تھا؟

۵- افسانہ نگار نے اس افسانے میں انسانی فطرت کی عکاسی کس طرح کی ہے؟

فریادِ خاموش

عزیز محمد بگٹی

حیدراں اپنے چہرے کی جھریوں میں خوشی کی عظیم چمک لیے اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت کو دیکھ رہا تھا۔ گندم کے خوشے ہوا سے جھوم رہے تھے۔ وہی خوشے جو بزگر کے سال بھر کی محنت و مشقت کا صلہ ہوتے ہیں۔ یہی اُن کی زندگی ہوتی ہے اور یہی کُل سرمایہ۔ ان خوشوں کو جھومتے ہوئے دیکھ کر حیدراں کا دل بھی خوشی سے لبریز ہو رہا تھا۔ فصل کی کٹائی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ حیدراں کو یوں معلوم ہو رہا تھا کہ خوشیاں دامن پھیلائے اس کے قریب آ رہی ہیں۔ اب وہ مالک کے پچھلے سال کا قرض بے باق کر دے گا اور بچوں کے لیے عید کے کپڑے بھی خرید لے گا۔ یہ تھے حیدراں کے خیالات جو اس وقت اس کے دل پر چھائے ہوئے تھے۔

عید کا دن قریب آ رہا تھا۔ حیدراں اپنے کِدان میں بیٹھا کسی نامعلوم خیال میں غرق تھا کہ اس کی چھوٹی بچی شاری اُس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ پہلے تو باپ کو چُپ چاپ دیکھ کر خاموش رہی۔ تھوڑی دیر بعد پیاری اور ملتجی نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ابا میرے کپڑے پھٹ گئے ہیں عید پر مجھے نئے کپڑے لے کر دو گے نا؟“

حیدراں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو پیار کیا اور کہا ”ہاں میری بچی! جب فصل کی بٹائی کروں گا تو اپنی شاری کے لیے شہر سے نئے کپڑے لاؤں گا۔ اب تو خوش ہو۔“

”میرے اچھے ابا“ کہہ کر وہ اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ اسی وقت ننھی سی بیٹی نمر دوڑتی ہوئی آئی اور توتلی زبان میں کہنے لگی ”ابا! میرے لیے عید کے کپڑے اور گڈی ضرور لانا۔“

”ہاں میری پیاری گڑیا! تمھارے لیے کپڑے اور گڈی ضرور خریدوں گا بالکل پریوں جیسی گڈی۔“

یوں ہر ایک تشنہ آرزوؤں کا سرچشمہ وہ فصل تھی جس کی چند دنوں میں بٹائی ہونے والی تھی۔

آخر فصل کی بٹائی کا دن آ گیا۔ زمیندار اُس روز خود کھیت پر آیا۔ بٹائی شروع کی گئی۔ حیدراں کھڑا فرطِ مسرت سے جوہان (خرمن) کی طرف دیکھ رہا تھا اُس کی خوشیاں اندازے سے باہر تھیں۔ اس کا دل گویا خوشیوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔

"مجھے اپنی محنت کا ثمر مل گیا ہے۔ اب شاری اور نمر کی فرمائش پُوری کر دوں گا۔ اپنے حِصّے میں سے کچھ غلّہ بازار میں بیچ کر اپنے معصوم بچّوں کے لیے کپڑے اور گُڑیا خریدوں گا۔

آخر بٹائی ختم ہو گئی۔ زمیندار نے اپنا حصّہ الگ کر کے مزارعین کو اُن کا حصّہ دے دیا۔ کھیت کی پیداوار میں نصف حصّہ صرف ایک شخص یعنی زمیندار لے گیا بقیہ نصف حِصّہ کئی بزگروں کے نصیب میں آیا۔ وہی بزگر جنھوں نے اپنی تمام تر محنت اور قوّت سے یہ فصل اُگایا تھا، پھر یہیں تک بس نہیں، اب وہ ہر بزگر سے اپنا قرض بصورتِ جنس وصُول کرنے لگا۔ ہوتا یُوں ہے کہ بیج کے دِنوں میں کِسانوں کو بیج کے لیے جنس کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اِس وقت اُن کے پاس فاقے کی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ مجبور ہو کر زمینداروں کی منّت سماجت کرتے ہیں اور وہ ہزار منّتوں کے بعد بزگروں کو غلّہ کی کچھ مقدار مہنگی سے مہنگی قیمتوں پر دے دیتے ہیں۔ اُن کا احسان الگ ہوتا ہے۔ بعد میں بٹائی کے وقت وہ اپنے مذکورہ قرض کو دو تین گنا زائد کے حساب سے وصُول کرتے ہیں چونکہ فصل کے وقت تاجر غلّہ کی قیمت گرا دیتے ہیں۔ زمیندار کو تو غلّہ ذخیرہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے، مگر بزگر اپنا قرض اتارنے کے لیے سستی قیمتوں پر اپنی پیداوار دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

حیدراں نے اپنے حِصّے میں سے زمیندار کا قرض اسی انداز میں چکایا اب اس کے حصّے میں کل پندرہ سولہ من غلّہ رہ گیا جو اس کے چھ ماہ کی محنت و مشقت کا ثمر تھا اور یہی چھ ماہ کی خوراک و ضروریات یہی اس کی آمدنی اور کل کائنات تھی۔

غلّہ گھر میں پڑا تھا۔ اس کی نظریں اُن پر جمی ہُوئی تھیں۔ یُوں محسوس ہوتا تھا کہ دُنیا بھر کی مایوسیاں سمٹ کر اُس کی نگاہوں میں آ گئی تھیں۔ اُس کی محنت کے پھل کو دُوسرے اس کے سامنے لے گئے تھے اور اس کے نصیب میں پھر وہی فاقے، وہی حسرتیں اس کا استقبال کر رہی تھیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے شاری اور نمر کے چہرے گھومنے لگے۔ معصُوم مسکراتے ہُوئے چہرے اس سے پُوچھ رہے تھے کہ ابّا اب تو آپ نے فصل اُٹھائی ہے۔ اب پُوری کر دیجیے نا ہماری آرزو۔ حیدراں کو یوں محسوس ہُوا جیسے یہ معصُوم بچّے کپڑے اور گڑیا نہیں مجھ سے میری زندگی مانگ رہے ہیں۔ ضمیر طلب کر رہے ہیں۔ میں غلّہ بیچ کر ان کی چیزیں خرید لاؤں گا اور پھر جب تین چار ماہ بعد میری زندگی یعنی غلّہ ختم ہو جائے گا تو میں اپنے اور بچّوں کی زندگی کی بھیک مانگنے زمیندار کے پاس دامنِ سوال پھیلا کر جاؤں گا۔ اس کے سامنے گڑگڑاؤں گا اور اس سے کچھ غلّہ بطور قرض لے لُوں گا مگر اگلی فصل پر پھر وہی قصّہ دُہرایا جائے گا۔" نہیں نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا میں اپنا غلّہ اس مرتبہ ہرگز نہیں بیچوں گا"۔ اُس نے دِل میں

فیصلہ کرلیا۔ میں بچیوں کے لیے نئے کپڑے اور گڑیا نہیں خریدوں گا۔ گڑیا کھیلنے کا نمر سے کیا تعلق ہے۔ گڑیا تو مالک کی بیٹی ہی کھیل سکتی ہے۔ اگر اُس نے زیادہ تنگ کیا تو مٹی کی گڑیا ہی اس کے لیے کافی ہے۔ شاید اس کی قسمت میں یہی لکھ دی گئی ہے، نہ ہی اُن کے لیے نئے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ نئے کپڑے ہمارے لیے نہیں بنائے جاتے اُنھیں پہننے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ہمارے بھاگ میں تو پیوند لگے کپڑے ہیں۔ شاری اور نمر کو اپنے پُرانے کپڑوں کو پیوند لگا کر پہننا پڑے گا۔

ابھی وہ ان خیالوں میں محو سر جُھکائے بیٹھا تھا کہ ننھی نمر مُسکراتی ہُوئی حیدراں کے پاس آئی اور اپنا سر باپ کی آغوش میں رکھ کر پیار سے بولی۔

"ابا آج میرے لیے گڈی خرید وگے نا؟" اسی لمحے شاری بھاگتی ہُوئی آئی اور باپ کے کاندھے پر سر رکھ کر بولی۔" ابا! آج میرے لیے کپڑے خرید دگے نا۔ دیکھو میرے کپڑے کیسے پھٹ چُکے ہیں اور چوتھے دن عید ہے ان کو سینا بھی ہے"۔

حیدراں نے نظریں اُٹھا کر دونوں بچیوں کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آرزوؤں کے دیپک چمک رہے تھے۔ دونوں پُرامید نظروں سے التجا کررہی تھیں۔ اُس نے شاری کی طرف دیکھا اس کے کپڑے پھٹ چُکے تھے۔ جگہ جگہ سے کپڑوں کے چیتھڑے اُڑے ہُوئے تھے اور اُن کا معصوم بدن اُن کی اوٹ سے جھانک کر نئے کپڑوں کے لیے تقاضا کررہا تھا۔ آج پہلی بار حیدراں کو شاری کے کپڑوں کے پھٹنے کا احساس ہورہا تھا۔

اس سمے اس کا ذہن کسی انجانے تصور میں کھو گیا۔ آج اس کو اپنی غربت اور بے بسی کا احساس بُری طرح ستا رہا تھا۔ آج اُسے معلوم ہُوا کہ غریب کی سب سے بڑی خطا اس کی غربت ہے۔ غربت ہی اُسے محتاج بنا کر کسی کے دَر پر لے جاتی ہے۔ غربت ہی اس کے احساسِ برتری کو کچل دیتی ہے۔ اس کی اُمیدوں کو مایوسی میں بدل دیتی ہے جو انسان کو چور، ڈاکو اور قاتل بنا دیتی ہے، اگر دُنیا سے غربت مِٹ جائے تو بہت سی سماجی اور معاشرتی بُرائیاں خودِ بخود ختم ہو جائیں گی۔ شاری چونکہ ایک غریب بزگر کی بیٹی ہے اس لیے اس کے جسم پر پھٹی پشک (قمیص) ہے۔ وہ کسی ریشمی کپڑوں کی آرزو تک نہیں کرتی۔ اگرچہ وہ ایک معصوم بچّی ہے اور اُسے یہ خبر نہیں کہ غربت اور امارت کیا ہوتی ہے تاہم اسے اتنا پتا ہے کہ اعلیٰ ریشمی کپڑے زمیندار کے بچّے ہی پہنتے ہیں اور جو کپڑے وہ لوگ پہنتے ہیں وہ ہمیں نہیں پہننے چاہییں۔ وہ اگر خواہش کرتی بھی ہے تو صرف معمولی نئے کپڑوں کی، مگر اُسے یہ نہیں معلوم کہ ایک بزگر کے لیے اس خواہش کو پُوری کرنا بھی کتنی بڑی بات ہے۔

حیدراں کو ایک لمحے بچیوں کے معصوم جذبات کا خیال آیا۔ مگر دُوسرے ہی لمحہ وہ تصوّرات کی دُنیا سے نکل کر حقیقت کی دُنیا میں آگیا۔ اس کا خیال گھر کی طرف گیا۔ اگر اُس نے بچیوں کی خاطر غلّہ بیچ دیا تو فاقے اس کے منتظر ہوں گے زمیندار کی نہ جانے کس قدر منّتیں کرنی پڑیں گی۔

"نہیں۔ نہیں۔ اگر بچّوں کے لیے کپڑے اور گڑیا نہیں لیے تو ان کا معصوم دل ٹوٹ جائے گا۔ ان کی مایوسی شدید ہو جائے گی۔ عید کے دن جب ہر ایک عید کی خوشیوں میں مسکرا رہا ہوگا۔ بچّے ہر طرف نئے کپڑے پہنے خوشیاں منا رہے ہوں گے، میرے بچّوں کے دل پر حسرتوں کا راج ہوگا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے"۔ مگر پھر فاقوں کے خیال نے اُسے جھنجھوڑا اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ غلّہ ہرگز نہیں بیچے گا۔

اُس نے دونوں بچیوں کو آغوش میں لے کر پیار کرتے ہُوئے کہا۔ "میرے پیارے بچّو! اس سال فصل کم ہُوئی ہے۔ اس لیے تمھارے لیے کپڑے اور گڈی نہیں خرید سکتا۔ جب پیسہ ہوگا تو پھر خرید کر دوں گا اچھے سے کپڑے اور گڑیا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"۔

نہیں ابّا۔ دونوں بچیوں نے بیک زبان کہا۔ "کیا ہم عید کے دن انھیں پھٹے ہُوئے کپڑوں میں پھریں گے۔ ابّا ہمارے لیے نئے کپڑے لائیں نا"۔

"اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے"۔ حیدراں نے بچیوں کو سمجھانا شروع کیا۔ "اس عید پر گزارہ کرلو۔ اگلی فصل پر تم دونوں کے لیے عُمدہ کپڑے خرید کر لاؤں گا"۔ مگر بچے رونی سی آواز میں التجا کر رہے تھے۔ آخر اُس نے بچیوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے جھڑک کر کہا: "بھاگ جاؤ۔ تمھاری امّی تمھارے کپڑوں کو دھو کر ان پر پیوند لگا دے گی اور تم انھیں عید کے روز پہنو گے"۔

بچّے مجسم یاس و حسرت بن کر چلے گئے اور حیدراں وہیں بیٹھا زندگی کے اس نظام پر سوچتا رہا۔ "اے میرے خُدا! میں تو سارا سال ہل چلاتا ہوں، دھوپ ہو یا بارش یا یخ بستہ ہوائیں۔ مجھے کوئی کام سے نہیں روک سکتا۔ شب و روز کھیتوں کو پانی دیتا ہوں۔ یہی کھیت میری زندگی کا سہارا ہیں۔ میرے ہل اور میری محنت سے ہی یہ کھیت لہلہاتا ہے۔ لیکن جب اس میں فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے تو مجھے اس میں سے اس قدر بھی نہیں ملتا کہ اپنے معصوم جگر گوشوں کے لیے معمولی کپڑے تک خرید سکوں۔ تیری دُنیا کا یہ کیسا دستور ہے۔ کیا یہ تیرا فرمان ہے یا تیرے چند بندوں نے یہ دستور بنا رکھا ہے، اگر اس میں تیری رضا شامل نہیں تو تُو اُن کو اس ظلم سے روکتا کیوں نہیں۔ کیا ہماری زندگی پشت در پشت اسی طرح بسر ہوگی۔

آخر اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اُسے گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں رہی اور وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔

وہ سارا دن یونہی کھیتوں میں پھرتا رہا۔ جب ہر سو شام کے دُھندلکے پھیلنے لگے تو وہ اپنے گدان کو چلا آیا۔

بچّے سو چکے تھے۔ اُس نے اپنی بیوی کو بچّوں کے بارے میں بتایا۔ بیوی نے بھی اس بارے میں اس کی حمایت کی اور کہا بچّوں کی خیر ہے۔ ایک دن ذرا غمگین رہیں گے۔ دُوسرے ہی روز ہنسنے کھیلنے لگیں گے۔ بچّے ہی تو ہیں۔

اچھا کہہ کر وہ اُٹھا اور باہر غلّے کی بوری پر بیٹھ گیا۔ بڑی دیر کے بعد وہ اندر داخل ہُوا۔ بیوی بچّے سو رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہُوئے بچّوں کے قریب آیا۔ دونوں ساتھ ساتھ سوئے ہُوئے تھے۔ اُن کا مُنہ آسمان کی طرف تھا، جیسے آسمان والے سے فریاد کر رہے ہوں۔ چیتھڑوں کی اوٹ سے ان کا معصوم جسم جھانک جھانک کر خاموش فریاد کرتا نظر آ رہا تھا۔ اُن کی پلکیں بھیگی ہُوئی سی لگتی تھیں مگر لبوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ کی ضو تھی۔ اُداس چہرے، ایک ادائے معصومیت لیے ہُوئے۔

یہ شاید اُن کی خواہش کے مِٹ جانے کی حسرت تھی۔ اُس نے دیر تک اُن کے معصوم چہروں کو دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی۔

اُس نے دونوں بچیوں کا بوسہ لیا اور وہیں ان کے ساتھ سو گیا۔

صُبح اُٹھتے ہی وہ کچھ غلّہ لے کر شہر چلا گیا۔ غلّہ بیچ کر اپنی بچیوں کے لیے نئے کپڑے اور گڑیاں خریدیں۔ جب واپس گھر آیا تو شاری اور نمر مسکراتی ہُوئی اُس سے لپٹ گئیں۔ "دیکھو تو بیٹے میں شہر سے تمھارے لیے کیا لایا ہوں"۔ حیدراں نے پُوچھا۔

"پُرانے کپڑوں کو شہر میں دھوبی سے اُجلا اُجلا دُھلا کر لائے ہو۔ ٹھیک ہے نا آباجی"۔ بچیوں نے جواب دیا۔

"نہیں بیٹے"۔ حیدراں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "تم بھی عید کے دن دُوسرے بچّوں کی طرح عمدہ نئے کپڑے پہنو گی۔ میں تمھارے لیے نئے کپڑے اور گڑیا بھی خرید کر لایا ہوں۔ اب تم عید کے دن خوش رہو گی نا"۔

"ابا"۔ دونوں بچیاں باپ سے لپٹ گئیں۔

"ہاں میرے بچّو - تم بھی مسکراؤ گی - ہنسی خوشی کھیلو گی یہی میری خوشی ہے - یہی میرا حاصل زندگی - غربت تمھارے معصوم جذبات کی قیمت نہیں"۔

حیدراں نے دونوں کو باہنوں میں بھینچ لیا اور ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے جن میں خوشی بھی شامل تھی۔

علاقائی ادب (بلوچی) سے انتخاب۔

مشق

۱ - حیدراں کی سوچ میں جو کش مکش کی کیفیت پائی جاتی تھی اس کا خلاصہ لکھیے۔

۲ - حیدراں نے آخر کیا فیصلہ کیا ؟

۳ - حیدراں کے آخری فیصلے کے محرکات کیا تھے ؟

۴ - حیدراں کی بیوی نے کیا مشورہ دیا تھا اور اس کی بات کی تصدیق کس طرح ہوتی ہے ؟

۵ - اس کہانی میں متعلقہ علاقائی زندگی کا جو عکس پیش کیا گیا ہے اُسے اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

۶ - انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

ملتجی - تشنہ آرزو - سرچشمہ - فرطِ مسرت - خیالوں میں محو ہونا - اوٹ - جگر گوشہ - پشت در پشت - ضو۔

۷ - ان کے متضاد لکھیے۔

امارت ، اُجلا ، مسرت ، تشنہ ، سمٹنا ، محتاج ، پاس۔

۸ - حیدراں نے جو فیصلہ کیا اس کے مطابق اُسے فصل سے پہلے پھر قرض لینا پڑے گا تب زندگی کی گاڑی کا پہیہ چلے گا۔ اگر وہ یہ فیصلہ نہ کرتا تو اُس کے پاس آئندہ فصل تک کی ضرورت کا غلہ موجود ہوتا - آپ کے خیال میں حیدراں کا فیصلہ درُست تھا یا غلط۔ اپنے نظریے کے لیے استدلال پیش کیجیے۔

محسن کاکوروی

نعت

(مدحِ خیر المرسلینؐ)

گلِ خوش رنگ، رسولِ مدنی و عربی — زیبِ دامانِ ابد، طُرّۂ دستارِ ازل
نہ کوئی اُس کا مشابہ ہے، نہ ہمسر نہ نظیر — نہ کوئی اُس کا مماثل، نہ مقابل، نہ بدل
مہرِ توحید کی ضو، اوجِ شرف کا مہِ نو — شمعِ ایجاد کی لو، بزمِ رسالت کا کنول
ہفت اقلیمِ ولایت میں شہِ عالی جاہ — چار اطرافِ ہدایت میں نبیِ مُرسل
دین و دُنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے — صرف تیرا ہو بھروسہ، تری قوت، ترا بل
صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مدّاح — ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ، یہ غزل

(انتخاب از قصیدہ بہاریہ نعتیہ)

مشق

۱- نعت کسے کہتے ہیں؟ اس نعت کے علاوہ تین نعتیہ اشعار لکھیے۔
۲- تشریح کیجیے۔
نہ کوئی اس کا مشابہ ہے، نہ ہمسر، نہ نظیر — نہ کوئی اس کا مماثل، نہ مقابل، نہ بدل
۳- اس نظم میں شاعر نے کس کس تمنّا کا اظہار کیا ہے؟

میر انیس

حضرت عباسؓ کی میدانِ جنگ میں آمد

ہے شور کہ سقّائے حرم آتا ہے رَن میں　　پانی کے لیے ابرِ کرم آتا ہے رن میں
بازوئے شہنشاہِ اُمَم آتا ہے رَن میں　　اسلام کے لشکر کا عَلم آتا ہے رن میں
پرچم وہ سنہرا نظر آتا ہے عَلَم کا
دیکھو وہ پھریرا نظر آتا ہے عَلَم کا

صف باندھے ہُوئے محوِ وغا تھے ستم آرا　　جو حضرتِ عباس نے بڑھ کر یہ پکارا
اے بے خبرو! گھاٹ سے کر جاؤ کنارا　　ہم شیر ہیں مسکن ہے ترائی میں ہمارا
کس شان سے آتے ہیں کوئی ٹوک کے دیکھے
دعویٰ ہو کسی کو تو ہمیں روک کے دیکھے

فرزندِ محمّد ہے مِرا مالک و مختار　　فرمائیں تو دریا میں ابھی ڈال دوں رہوار
کہہ دیں تو ابھی کُود پڑوں آگ میں اک بار　　گر حکمِ وغا دیں تو کروں لاکھوں سے پیکار
رستم ہوں تو اُن کا ہوں جو صفدر ہوں تو اُن کا
بندہ ہوں تو اُن کا جو برادر ہوں تو اُن کا

ظالم نے کہا تب کہ نہیں ملنے کا پانی　　نقصان تھا کیا بیعتِ حاکم جو نہ مانی
تھرّا گیا یہ سُن کے یداللہ کا جانی　　فرمایا زباں روک لے او ظلم کے بانی
جس وقت بڑھیں پھر کہیں دم لیتے ہیں دریا
لے دیکھ بس اک حملے میں ہم لیتے ہیں دریا

یاں تیغِ جگر بندِ علیؑ میان سے نِکلی
کس زرق سے کس برق سے کس شان سے نکلی
فریادِ دلِ قوم بنی جان سے نِکلی
اک تازہ پری تھی کہ پرستان سے نکلی
غل تھا کہ یہ کس چیز کا پرتو نظر آیا
حیرت ہے کہ دسویں کو مہِ نو نظر آیا

مشق

۱ - حضرت عباسؓ کی میدان جنگ میں آمد کا حال اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
۲ - دُوسرے چوتھے اور آخری بند کی تشریح کیجیے۔
۳ - حیرت ہے کہ دسویں کو مہِ نو نظر آیا۔ دسویں کو مہِ نو نظر آنے سے شاعر کی کیا مُراد ہے ؟

میر انیس

گرمی کی شدّت

وہ لُو وہ آفتاب کی حدّت، وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دُھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سُوکھے ہُوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
سُرخی اُڑی تھی پھُولوں سے سبزی گیاہ سے
سایہ کنویں میں اُترا تھا پانی کی چاہ سے

آبِ رواں سے مُنہ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھُپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مُردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نِکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافورِ صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھُپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

شیر اُٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے
آہو نہ مُنہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بُھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں،
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

مشق

۱- شاعر نے ان مصرعوں میں گرمی کی شدّت کا جو منظر پیش کیا ہے، اس کی وضاحت پیش کیجیے۔
ع کالا تھا رنگ دُھوپ سے دن کا مثال شب
ع خود نہرِ علقمہ کے بھی سُوکھے ہُوئے تھے لب
ے سُرخی اُڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے — سایہ کنوئیں میں اُترا تھا پانی کی چاہ سے
ے اگر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائیے راہ میں — پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں
ے مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زبان — تہہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
ے پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی — ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی
۲- اس نظم سے کم از کم دس تشبیہیں لکھیے اور اُن تشبیہوں کی موزونیت اور خُوبصورتی پر تبصرہ کیجیے۔
۳- اس نظم سے بخار اور آفتاب کے ہم قافیہ الفاظ تلاش کر کے لکھیے۔
۴- لب اور جاں کے پانچ پانچ ہم قافیہ الفاظ جو نظم میں موجود نہ ہوں لکھیے۔

علامہ اقبالؒ

محبّت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مُسلّم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے اُبھری ہی تھی دُنیا مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا ہویدا تھی نگینے کی تمنّا چشمِ خاتم سے
سُنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیا گر تھا صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پر اِک اکسیر کا نسخہ چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ رُوحِ آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب تمنّائے دِلی آخر بَر آئی سعیِ پیہم سے
پھرایا فکرِ اجزا نے اُسے میدانِ امکاں میں چھُپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے
چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی ، حُور سے پاکیزگی پائی حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیّت سے شانِ بے نیازی لی ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں مرکب نے محبّت نام پایا عرشِ اعظم سے
مہوس نے یہ پانی ہستیٔ نوخیز پر چھڑکا گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا گلے ملنے لگے اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

مشق

۱ - علامہ اقبال کی نظم "محبت" کے مطالب کا خلاصہ اپنے الفاظ میں نثر میں لکھیے۔

۲ - نظم میں سے مرکباتِ توصیفی تلاش کر کے لکھیے۔

۳ - ان اشعار کے مطالب سادہ زبان میں وضاحت سے بیان کیجیے۔

ے عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے — ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
ے کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا! — ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے
ے چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا — اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
ے تڑپ بجلی سے پائی، حُور سے پاکیزگی پائی! — حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابن مریم سے
ے ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی — ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
ے پھر ان اجزا کو گھولا چشمہ حیواں کے پانی میں — مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

۴ - علامہ اقبال کے نزدیک محبت اپنی تخلیق کے اعتبار سے کن صفات کی حامل ہے؟

۵ - نظم سے کوئی سی پانچ تشبیہات منتخب کر کے تبصرہ کیجیے کہ وہ اپنے مقصد کو اجاگر کرنے میں کس حد تک کامیاب ہیں۔

۶ - نظم میں "بارگاہِ حق کا محرم" اور "کیمیا گر" سے کون مراد ہے؟

۷ - نظم کے تیسرے شعر سے کون سا زمانہ مراد ہے؟

علامہ اقبال

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو
مآلِ حُسن کی کیا مِل گئی خبر تجھ کو؟
متاعِ نُور کے لُٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو؟
زمیں سے دُور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اُڑھائی قبائے زر تجھ کو؟
غضب ہے پھر تری ننھّی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دُوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گُل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

مشق

۱ - اس نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

۲ - شاعر نے ستارے کو خوف زدہ کس وجہ سے سمجھا ہے؟

۳ - "جو اوج ایک کا ہے دُوسرے کی پستی ہے"۔ اس موضوع پر مضمون لکھیے۔

علامہ اقبالؒ

مُسلمان

خُدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مُسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے!
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خُدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تُو ہے!
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خُونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تُو ہے!
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے!
جہانِ آب و گِل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوّت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تُو ہے!
یہ نکتہ سرگذشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تُو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

(اقتباس از طلوعِ اسلام)

مشق

۱ - علامہ اقبال نے اس نظم میں "مسلمان" کی کیا صفات بیان کی ہیں؟

۲ - علامہ اقبال نے اس نظم کے ذریعے مسلمانوں کو کیا پیغام دیا ہے؟

۳ - پہلے، تیسرے، چوتھے اور چھٹے شعر کی تشریح کیجیے۔

۴ - اس نظم کے قوافی لکھیے۔

۵ - ان ہم آواز الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کے معانی اور فرق واضح ہو جائے۔
نکتہ، نقطہ۔ گَرد، گِرد۔ ابد، عبد۔ گلی، گُل۔ عالَم، عالِم۔ بیضا، بیضہ۔ سَبَق، سُبک۔

۶ - علامہ اقبال کے شعری مجموعے "بانگِ درا" میں اس طرح کی بہت سی خوبصورت اور سبق آموز نظمیں ہیں۔ یہ کتاب لائبریری سے حاصل کر کے پڑھیے اور جو نظم آپ کو زیادہ پسند آئے اُسے اپنی کاپی پر نقل کر کے پسندیدگی کی وجہ بھی ساتھ لکھیے۔

علی گڑھ کے طلبہ سے

اختر شیرانی

(مشاعرے کی دعوت کے جواب میں)

کفر ہے بر سرِ پرخاش مسلمانوں سے
اے صبا کہنا علی گڑھ کے غزل خوانوں سے

چھین لو شمعیں ستاروں کے شبستانوں سے
اور گزر جاؤ مہ و مہر کے ایوانوں سے

چشمِ سیّد نگراں ہے کہ پھر اُٹھے شاید
کوئی دیوانہ محبت کے بیابانوں سے

وادی و دشت و جبل ہیچ ہیں ہمت کے لیے
یہ صدا آتی ہے اسپین کے میدانوں سے

عمل و علم سے قائم ہے نظامِ اسلام
یہ نہ ترکوں سے نہ عربوں سے نہ افغانوں سے

ایک آزاد نفس عمرِ قفس سے بہتر
یہ سبق ملتا ہے خیبر کے کہستانوں سے

اب تو اک قطرۂ خوں بھی نہ رہا بازو میں
کھیلتے تھے کبھی ہم خُون کے طوفانوں سے

اے علی گڑھ مرے اشعار میں کب تھی تاثیر
یہ شراب آئی ہے بطحا کے خمستانوں سے

مشق

۱ – اس نظم میں شاعر طلبہ کو کیا سبق دینا چاہتا ہے؟
۲ – چشمِ سیّد سے کیا مُراد ہے؟
۳ – چوتھے، چھٹے اور آخری شعر کی تشریح کیجیے۔

اخترؔ شیرانی

او دیس سے آنے والے

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن وہ سروِ وطن ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی دِلوں کو بھاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا
کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں احباب کنارِ دریا پر
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں شاداب کنارِ دریا پر
اور پیار سے آکر جھانکتا ہے مہتاب کنارِ دریا پر
او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی کسی کے سینے میں باقی ہے ہماری چاہ بتا
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب یاروں میں کوئی آہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا للہ بتا للہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا

مشق

۱ - اس نظم میں ماضی کے حوالے سے اپنے وطن کے حسن اور رنگینیوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اُسے نثر میں اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲ - اپنے وطن کی خوبصورتی، اس کی رونقوں اور اس کے عوام کی زندہ دل سرگرمیوں پر دو صفحات میں ایک مضمون لکھیے۔

۳ - اس نظم میں شاعر کی ایک خاص کیفیت ابھر کر سامنے آرہی ہے، اس کیفیت اور اس کے فطری پن پر روشنی ڈالیے۔

۴ - اس نظم میں "آوارۂ غربت" اور "کنعانِ وطن" کی ترکیبیں استعمال ہُوئی ہیں، ان سے کیا مراد ہے؟

۵ - چوتھے بند کی تشریح کیجیے۔

۶ - ان کے مترادف الفاظ لکھیے۔

پربت ، گھٹا ، برکھا ، پیڑ۔

۷ - وطن کی خوبصورتی بیان کرنے کے لیے جو تشبیہیں اور تراکیب استعمال ہُوئی ہیں انھیں تلاش کر کے لکھیے۔

۸ - اگر شاعر یہ مصرعہ

کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں   کی بجائے یوں لکھتا؟

کیا اب بھی وہاں کے پربت پر وہ کالی بدلیاں چھاتی ہیں   تو آپ کے خیال میں کیا فرق پڑتا؟

جوش ملیح آبادی

وطن

اے وطن! پاک وطن! روحِ روانِ احرار
اے کہ مٹی میں تری بُوئے چمن، رنگِ بہار
اے کہ خوابیدہ تری خاک میں شاہانہ وقار
اے کہ ہر ذرّۂ ناچیز ترا، رشکِ نگار
ریزے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈّیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں

پائی غنچوں میں ترے رنگ کی دُنیا ہم نے
تیرے کانٹوں میں لیا درسِ تمنا ہم نے
تیرے قطروں میں سُنا نغمۂ دریا ہم نے
تیرے ذرّوں میں پڑھے قصۂ صحرا ہم نے
کیا بتائیں کہ تری بزم میں کیا کیا دیکھا
ایک آئینے میں دُنیا کا تماشا دیکھا

آنکھ جس چیز میں کھولی وہ فضا تھی تیری
پہلے جو کان میں آئی وہ صدا تھی تیری
پالنا جس نے ہلایا وہ ہوا تھی تیری
جس نے گہوارے میں چوما وہ صبا تھی تیری
شیرِ مادر کا ملا لطف غذا میں تیری
بھیگی ہیں اپنی مسیں آب و ہوا میں تیری

اے وطن! آج سے کیا ہم ترے شیدائی ہیں
آنکھ جس دن سے کھلی تیرے تماشائی ہیں
اِک زمانے سے ترے حسن کے سودائی ہیں
ہم تو بچپن سے فقط تیرے تمنائی ہیں
بھائی طفلی سے ہر اک آن جہاں میں تیری
بات تُتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری

تجھ کو، جیتے ہیں تو، غم ناک نہ ہونے دیں گے　　ہم زمیں کو تری ناپاک نہ ہونے دیں گے
ایسی اکسیر کو یوں خاک نہ ہونے دیں گے　　تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دیں گے
جی میں ٹھانی ہے یہی جی سے گزر جائیں گے
دل بہت اب جو ستائے گا تو مر جائیں گے

مشق

۱۔ وطن کی محبت میں شاعر نے خود سے کیا عہد کیا ہے؟
۲۔ وطن سے شاعر کو کیا ملا؟ اور ان نعمتوں کا شکریہ شاعر نے کس طرح ادا کیا ہے؟
۳۔ "ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں" سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
۴۔ "بات تتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری" سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
۵۔ پہلے اور تیسرے بند کی تشریح کیجیے۔
۶۔ اِن الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا باہمی فرق واضح ہو جائے۔
فِقرہ، فُقراء۔ فضا، افزا۔ صدا، سدا۔ شیر، شِیر۔ صبا، سبا۔ سَودا، سودا۔ چاک، چاق۔
۷۔ سابقے لاحقے بدل کر متضاد الفاظ بنائیے۔ غم ناک۔ خوابیدہ۔ ناپاک۔
۸۔ درست اعراب لگائیے: وقار۔ نغمہ۔ میں۔ اکسیر۔ لطف۔ فقط۔

جوش ملیح آبادی

وحدتِ انسانی

اے دوست، دل میں گردِ کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون، پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو مرغ زار کا
پالا ہُوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا

ہوتے ہیں پائے مال، تو کہتے ہیں زرد پھول
کل رحمتِ عمیم کا، ہم پر بھی تھا نزول
خوبانِ بوستاں میں، ہمارا بھی تھا شمول
اے راہ رو، نہ ڈال ہمارے سروں پہ دھول

ہر چند، انجمن کے نکالے ہُوئے ہیں ہم
لیکن، صبا کی گود کے پالے ہُوئے ہیں ہم

بے جان و جان دار کی بُنیاد ایک ہے
ارض و سما کی علتِ ایجاد ایک ہے
بُت سیکڑوں ہیں، حُسنِ خداداد ایک ہے
سب دل الگ الگ ہیں مگر یاد ایک ہے

یک ساں ہے مال، گو ہیں دُکانیں جُدا جُدا
معنی ہیں سب کے ایک، زبانیں جدا جُدا

جو، روشنی چکاں ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
جو، تیرگی فشاں ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
جو، یارِ مہرباں ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اور، جو، عدوئے جاں ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
تُو، بھاگ، خواہ موت سے، یا زندگی سے بھاگ
اے آدمی، کبھی نہ مگر آدمی سے بھاگ

مشق

۱- اس نظم کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔
۲- دُوسرے اور تیسرے بند کی تشریح کیجیے۔
۳- مرکباتِ توصیفی تلاش کر کے لکھیے۔
۴- ان کے متضاد لکھیے۔
نفرت، سر، عدو، ارض، تیرگی، موت، وحدت۔

اسرار الحق مجاز

پاکستان کا مِلّی ترانہ

(یہ ترانہ قیام پاکستان سے تین سال قبل شائع ہوا تھا اور بہت مقبول رہا تھا)

آزادی کی دُھن میں کِس نے آج ہمیں للکارا
خیبر کے گردوں پہ چمکا ایک ہلال اک تارا
سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر سارا
پربت کے سینے سے پھوٹا کیسا سرکش دھارا
سرمایہ کا سُوکھا جنگل اِس میں سُرخ شرارا
پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا

سو انجیلوں پر ہے بھاری اِک قرآن ہمارا
روک سکا ہے کوئی دشمن کب طوفان ہمارا
ہر تُرک اپنا، ہر حُرا اپنا، ہر افغان ہمارا
ہر شخص اک انسان یہاں ہے ہر انسان ہمارا
ہم سب پاکستان کے غازی پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا

(شب تاب، اسرار الحق مجاز)

مشق

۱ ۔ ان مصرعوں کی وضاحت کیجیے۔

(i) خیبر کے گردوں پہ چمکا ایک ہلال اک تارا۔

(ii) پربت کے سینے سے پھوٹا کیسا سرکش دھارا۔

(iii) سرمایہ کا سوکھا جنگل اس میں سُرخ شرارا۔

(iv) سو انجیلوں پر ہے بھاری اِک قرآن ہمارا۔

۲ ۔ قیامِ پاکستان کے پس منظر اور نظریہ پاکستان کے بارے میں اپنے خیالات ایک صفحے میں لکھیے۔

۳ ۔ اس ترانے سے مرکبات توصیفی تلاش کر کے لکھیے۔

۴ ۔ شاعر کا ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے بارے میں کیا خیال ہے؟

سیّد محمد جعفری

تھرڈ ڈویژن

جینے کی کش مکش میں نہ بیکار ڈالیے
میں تھرڈ ڈویژنر ہوں مجھے مار ڈالیے
پھر نام اپنا قوم کا معمار ڈالیے
ڈگری کو میری لیجیے اچار ڈالیے

کچھ قوم کا بھلا ہو تو کچھ آپ کا بھلا
میرا بھلا ہو کچھ مرے ماں باپ کا بھلا

جاتا ہے جس جگہ بھی کوئی تھرڈ ڈویژنر
کہتے ہیں سب کہ آگیا تو کس لیے ادھر
تو چل یہاں سے تیری نہ ہوگی یہاں گزر
"لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر ہوں میں" مگر

"یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے"
ہر شخص مجھ کو آنکھ دکھاتا ہے کس لیے

میں پاس ہو گیا ہوں مگر پھر بھی فیل ہوں
تعلیم کے اداروں کے ہاتھوں میں کھیل ہوں
جس کا نشانہ جائے خطا وہ غلیل ہوں
میں خاک میں ملا ہوا مٹی کا تیل ہوں

اور یونیورسٹی بھی نہیں ہے ریفائنری
صورت بھی تصفیے کی نہیں کوئی ظاہری

اخبار میں نے دیکھا تو مجھ پہ ہوا عیاں
ہوتے ہیں پاس وہ بھی نہ دیں جو کہ امتحاں
یعنی کہ آنریری بھی ملتی ہیں ڈگریاں
میں جس زمیں پہ پہنچا وہیں پایا آسماں

ہے آسماں کی گردشِ تقدیر میرے ساتھ
ڈگری ہے اک گناہوں کی تحریر میرے ساتھ

گر ہو سکے تو مانگ لوں اِک عُمر کو اُدھار
اور امتحان جس کا نہیں کوئی اعتبار
اس امتحاں کی بازی لگاؤں گا، بار بار
کہتے ہیں لوگ اس کو یہ مچھلی کا ہے شکار

یہ امتحان مچھلی پھنسانے کا جال ہے
"عالمِ تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"

مشق

۱ – تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والے کن مشکلات کا شکار رہتے ہیں ؟

۲ – "میں پاس ہو گیا ہوں مگر پھر بھی فیل ہوں　　تعلیم کے اداروں کے ہاتھوں میں کھیل ہوں
جس کا نشانہ جائے خطا وہ غلیل ہوں　　میں خاک میں ملا ہوا مٹی کا تیل ہوں
اور یونیورسٹی بھی نہیں ہے ریفائنری
صورت بھی تصفیے کی نہیں کوئی ظاہری"　　تشریح کیجیے۔

۳ – "میں جس زمیں پہ پہنچا وہاں پایا آسماں" سے کیا مراد ہے ؟

۴ – اس نظم میں بعض مصرعے واوین میں ہیں مثلاً
"لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر ہوں میں" مگر
"یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے"
"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"
یہ مصرعے واوین میں کیوں لکھے گئے ہیں، وضاحت کیجیے۔

۵ – امتحانات کے بارے میں شاعر کا کیا نظریہ ہے ؟

خواجہ میر دردؔ

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی
خطرہ جو ہے سو آئینۂ دل پہ زنگ ہے

حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ
یاں ٹک بھی جس کی آنکھ کھلی ہے سو دنگ ہے

اس ہستیٔ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشۂ ظہور! یہ تیری ترنگ ہے

گل گیر! منہ پسار نہ تو شمع کی طرف
اس کی زبان ہی اسے کامِ نہنگ ہے

عالم سے اختیار کی ہر چند صلحِ کل
پر اپنے ساتھ مجھ کو شب و روز جنگ ہے

میں کیا کہوں تجھے نظر آتا نہیں ہے کیا
اس گلشنِ جہان کا جو کچھ کہ ڈھنگ ہے

غنچہ شگفتہ ہووے ہی ہووے کہ اس میں دردؔ
دیکھا چمن میں جا کے تو کچھ اور ہی رنگ ہے



ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آ کے ہُو کریں

تردامنی پہ شیخ، ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سرتا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
مُنہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گُل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہی اعتبار
کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بُو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے دردؔ آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

مرزا غالبؔ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

قید میں یعقوبؑ نے گو لی نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو، فروزاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے، غزل خواں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

ہم مُوحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم، کہ ویراں ہوگئیں



آہ کو چاہیے اِک عمر، اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں! کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو، فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی غافل
گرمئ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو، جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک



دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش! پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ق

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نِگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا، دُعا کیا ہے

ہاں! بھلا کر! ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

مولانا حالی

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

کر دیا چپ واقعات دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت



ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے، دیکھیے، جا کر نظر کہاں

یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا، اُس کو ہم سے ربط، مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیاں کسَل و رنج راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو، تو زباں میں اثر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

حسرت موہانی

بھلاتا لاکھ ہوں، لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ اُلفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی، تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں



وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوقِ بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں!

التفاتِ یار تھا اِک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں



حفیظ جالندھری

تُو ہی بھروسا، تُو ہی سہارا — پروردگارا! — پروردگارا!
منظور، منظور — اے اہلِ دُنیا — اللہ میرا — باقی تمھارا
یُوں میں نے جیتی اُلفت کی بازی — اک بار کھیلا، سو بار ہارا
حاضر ہوں میں بھی، حاضر ہے دل بھی — دل بھی تمھارا، میں بھی تمھارا
یہ "ناخدا" ہے اے اہلِ کشتی — شاید کسی وقت کر لے کنارا
سیراب کر دے دُنیا میں ساقی — عقبیٰ کی تلخی مجھ کو گوارا!
روئے فلک پر چھائی سفیدی — چمکا ہے شاید میرا ستارا
آنکھوں میں آنسو، لب پر تبسم — اُن کا تصوّر، اپنا نظارا!
جینا پڑے گا، اے جانِ شیریں — کرنی پڑے گی تلخی گوارا
مٹی کے پُتلے! کیا چاہتا ہے — بختِ سکندر یا تختِ دارا
عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی — وہ بھی نہ ہارے، میں بھی نہ ہارا

پھر یہ جہنم کس کے لیے ہے
آمرزگارا! — آمرزگارا!!

○



اے دوست مٹ گیا ہوں، فنا ہو گیا ہوں میں
اس دردِ دوستی کی دوا ہو گیا ہوں میں

قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دُنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہوں میں

ناآشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست
کم بخت جانتے نہیں، کیا ہو گیا ہوں میں

ہنسنے کا اعتبار نہ رونے کا اعتبار
کیا زندگی ہے جس پہ فِدا ہو گیا ہوں میں

ہمت بلند تھی مگر افتاد دیکھنا!
چپ چاپ آج محوِ دُعا ہو گیا ہوں میں

یہ زندگی فریبِ مسلسل نہ ہو کہیں
شاید اسیرِ دامِ بلا ہو گیا ہوں میں

اُٹھا ہوں اِک جہانِ خموشی لیے ہُوئے
ٹوٹے ہُوئے دِلوں کی صدا ہو گیا ہوں میں

ہاں کیفِ بیخودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا، خدُا ہو گیا ہوں میں

قطعات

مرزا محمود سرحدی

کیا بتائیں آپ کو کیا ہے ہمارا ہسپتال — انتظام ایسا کہ بس دل کی کلی کھل جائے ہے
حادثاتِ اتفاقی کا بھی ہے اک ڈاکٹر — اتفاقی طور پر مل جائے تو مل جائے ہے

○

میں نے اک صاحب سے پوچھا ایسی حالت تو نہ تھی — قوم کے سر پر تھا جب تک قائدِ اعظمؒ کا ہاتھ
ہنس کے فرمانے لگے مجھ سے کہ سن اے بے خبر — قائدِ اعظم کی باتیں قائدِ اعظم کے ساتھ

○

پردہ تو اُٹھ گیا تھا مگر شرم تھی ضرور! — افسوس وہ بھی اُٹھ گئی اپنے یہاں سے آج
دولت ہی اب تو وجہ شرافت ہے دہر میں — جانے کسی کو کیوں کوئی نام و نشاں سے آج

○

تمام زر کے کرشمے ہیں آج دُنیا میں — شریف کوئی نہیں ہے رذیل کوئی نہیں
جو اپنی آپ کفالت نہ کر سکے محمود — تو جان لیجیے اس کا کفیل کوئی نہیں

○

قائم کچھ ایسے لوگوں کا دُنیا میں ہے وقار — دُنیا کچھ ایسے لوگوں پہ کرتی ہے اعتبار
چوروں کو جو دکھائیں مقامِ نقب زنی — اور مالکِ مکان سے کہہ دیں کہ ہوشیار

مشق

۱- آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا — دوست یہاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

حالی کے اس شعر میں حضرت یوسفؑ کے قصّے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کلام میں ایسے الفاظ لانا جس سے کسی قصّے، واقعے یا علمی مسئلے کی طرف اشارہ ہو اسے تلمیح کہتے ہیں۔ ان غزلوں میں سے تلمیحات چُن کر الگ لکھیے۔

۲- تشبیہ کے معنی مشابہت پیدا کرنے کے ہیں۔ کسی چیز کو کسی خاص وجہ سے کسی دوسری چیز کے مانند ظاہر کرنے کو تشبیہ

کہتے ہیں، مثلاً:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اس شعر میں اوس کے قطروں کو چمک دمک کی وجہ سے موتیوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اپنی کتاب کے حصۂ شاعری میں سے وہ شعر لکھیے جن میں تشبیہ موجود ہو۔

۳۔ جب کسی لفظ کو حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال کیا جائے اور حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق پایا جاتا ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں، مثلاً کوئی دکاندار آم بیچ رہا ہو اور آواز لگائے شہد لے لو، شہد لے لو۔ تو یہ استعارہ ہوگا کیونکہ آم کو مٹھاس کی وجہ سے شہد کہا گیا ہے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

اس شعر میں حضرت عباس کو بہادری کی وجہ سے شیر کہا گیا ہے اور یہ استعارہ ہے۔

تشبیہ اور استعارہ میں نمایاں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں طرفین تشبیہ میں سے دونوں کا بیان ہوتا ہے جب کہ مؤخر الذکر میں صرف ایک کا، مثلاً احمد لومڑی کی طرح مکار ہے کہنا تشبیہ ہے جب کہ احمد کو دیکھ کر کہنا کہ لومڑی ہے استعارہ کہلائے گا۔ ان غزلوں میں سے استعارہ کی نشاندہی کیجیے۔

۴۔ درد، غالب، حالی، حسرت اور حفیظ جالندھری کی شاعرانہ خوبیوں کا جائزہ لیجیے۔

حمد الٰہی

سب سے اوّل حمد خُدا کی جو مالک ہے سب کا
کسی مہم نہ ہرگز ہارے نام جپے جو رب کا

کام سنوارے بندوں کے اُس ذات کا اسمِ عالی
قہر اس کا خاکستر کردے، رحم کرے ھریالی

روئے زمیں پر اُس کی قدرت گل گلزار سجائے
رنگ برنگے پھول کھلائے پیڑ درخت اُگائے

ایسے خوب سروپ چمن میں آدم زاد بسایا
ڈال ڈال کا میوہ — علمی معرفتی سرمایہ

اس پہنائی کو کیا پائے بندوں کی دانائی
لوح و قلم جس کی چوکھٹ پر کریں جبیں فرسائی

حکم بن اس کے ہلے نہ تنکا مولا مالک، والی
اس کی نظر میں سب جیو جیون، کیا پتّہ، کیا ڈالی

امکاں ہے مگر پھر اس سے کوئی مکان نہ خالی
ہر ہر ساعت ہر ہر شے کی کرے وہی رکھوالی!

اِک پتّے پر سو رگ ریشے کس حکمت سے جوڑے
اُس کا علم تلاش بغیر بھی کوئی ذرّہ نہ چھوڑے

بادشہوں سے بھیک منگائے، درماندوں کو شاہی
اپنی حکمت خود وہ جانے بے پروا الٰہی!

فلک ملائک اس پیشی میں صمٌ بکمٌ سارے
اعلیٰ سے اعلیٰ واں عاجز، کون کوئی دم مارے

گرے پڑوں کو ہاتھ سے تھامے، بخشے سوکھتائیں
رس لفظوں کو، بول زباں کو، سُخن کو رُوپ سبھائیں

اُس کے در سے جو ٹھکرایا، دَر دَر سے ٹھکرایا
جُھکا جو اُس کے دَر پر اُس نے اُونچا رُتبہ پایا

لطف دہندہ، کرم کنندہ، سب کے کام سنوارے
خلقت کا خالق رکھوالا، بھید وہ جانے سارے

مسکینوں پر چھائے رکھے لُطف وکرم کا چھاتا
بن مانگے لکھ دان دِلائے، صاحب سائیں داتا

پتّھر اندر لعل ٹکاوے، پارکھ قیمت پائیں
سبز تنوں سے پُھول نکالے رنگیں، نرم قبائیں

سیپ صدف سے موتی بن کر نکلے قطرہ پانی
ماں کے پیٹ سے باہر آئے، صورت بی بی رانی

گوش بغیر وہ سُننے والا، دیکھے وہ بِن نیناں
بنا زبان کلام کرے وہ، بھائی اُس نہ بھیناں

میاں محمدؒ کے پنجابی کلام "سیف الملوک" سے
منظوم اُردو ترجمہ از سید ضمیر جعفری
(من میلہ، مطبوعہ قومی لوک ورثہ اسلام آباد)

ہمّتِ مرداں

ہمتِ مرداں مدد خدا کی، سر بالا ہوں راندے
جو مردوں کا ہاتھ نہ پکڑیں وہ ماندے در ماندے

اس کے پاس جب آئے کوئی حاجت مند سوالی
پائے دلی مُرادیں اپنی جائے کبھی نہ خالی

کاج سنواریں، گرہیں کھولیں، توڑیں بند سلاسل
مَردوں کا جو دامن تھامیں حل اُن کی ہر مشکل

مرد کسی کا درد نہ چھوڑیں، اُن کی خیر کثیرہ
کامل لوگ محمدؐ بخشا، پتھر کر دیں ہیرا

مَرد نہیں جو اوگھٹ میں دل چھوڑے ہمت ہارے
مرد نہیں جو مشکل وقت میں ڈھونڈے اَور سہارے

جب تک سانس کی ڈوری جاری آس کی باس بھی جاری
ڈھونڈے گا تو پائے گا، گر تھکا تو قسمت ہاری

ہمت آس ہے ہمت کے بن بندہ سخت نراسا
دَر دَر مانگے بھر جاتا ہے بھک منگوں کا کاسا

جب مقصود کے گُل اثمار سے بھر جاتی ہے جھولی
یاد نہیں رہتی کوئی مشکل، جو ہولی سو ہولی

جس دل اندر ہوگی بھائی اک روشن چنگاری
اس قصّے کو پڑھ کر آگ الاؤ ہوگا جاری!

میاں محمد کے پنجابی کلام "سیف الملوک"
کا منظوم اُردو ترجمہ از سیّد ضمیر جعفری
(من میلہ مطبوعہ قومی لوک ورثہ اسلام آباد)

تیار کردہ: این بلیو ایف پی ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور و منظور کردہ قومی ریویو کمیٹی
وفاقی وزارت تعلیم، حکومت پاکستان، بطور واحد نصابی کتاب برائے جماعت
دوازدہم (اُردو لازمی) برائے صُوبہ سرحد و قبائلی علاقہ جات۔

قومی ترانہ

پاک سَر زمین شاد باد کِشورِ حَسین شاد باد
تو نشانِ عَزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سَر زمین کا نِظام قُوّت اُخوّت عوام
قوم، مُلک، سلطنت پائندہ تابِندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچم ِستارہ و ہلال رَہبرِ ترقّی و کمال
ترجُمانِ ماضی شانِ حال جانِ اِستقبال
سایۂ خُدائے ذُوالجلال

کوڈ نمبر	تعداد	قیمت	مطبع	سیریل نمبر
DJ/B-22/56(0)	15000	18:00	ڈی جے پرنٹرز	5033